ترجمہ وتلخیص

سید امیر علی کی اسپرٹ آف اسلام کا تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر مقصود احمد مترجم: منور حسین فلاحی

سید امیر علی کی تصنیف "دی اسپرٹ آف اسلام" اسلام پر مغربی اہل قلم کی طرف سے ہونے والے اعتراضات کا اولین بھرپور غیر مرعوبانہ جائزہ ہے۔ اس میں نہ صرف عقلی و فکری سطح پر اسلام اور حضرت محمدؐ کی حقانیت، افضلیت اور ضرورت ثابت کی گئی ہے بلکہ تاریخی طور پر ان تمام الزامات کو بے بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ جو رسول اکرمؐ کی ذات اور آپ کے مشن پر مستشرقین کی طرف سے عائد کیے گئے ہیں۔ گو کہ بعض مقامات پر مغربی فکر سے مرعوبیت کی جھلک بھی ملتی ہے۔

اس تبصرہ میں اس بات کی گنجائش یقیناً موجود تھی کہ زیر تبصرہ کتاب کے تمام مشتملات کا احاطہ کیا جاتا۔ غالباً اختصار کے خیال سے بعض مباحث کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ کتاب سے بھرپور تعارف کے لیے ان کا احاطہ بھی ہونا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ کتاب کے بعض مباحث پر ناقدانہ نگاہ کی ضرورت ہے مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کا مسئلہ جس پر حصہ اول کے دسویں باب میں بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح اسلام میں مذہبی و سیاسی گروہ بندیوں کے مباحث جو حصہ دوم کے آٹھویں باب کا موضوع ہیں خاص طور پر زیر مطالعہ آنے چاہئیں۔ ان دونوں ابواب میں سنیوں اور شیعوں کے اختلافات بھی زیر بحث آئے ہیں اور موخر الذکر باب میں محض شیعی نقطۂ نظر کی ترجمانی کی گئی ہے۔ حصہ دوم کا آٹھواں باب دراصل حصہ اول کے دسویں باب ہی کے اجمال کی تفصیل و توضیح ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض مسائل میں مصنف نے اہل تشیع سے جداگانہ نقطۂ نظر اختیار کیا ہے اور ان کی غلطیوں اور بے اعتدالیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔

(منور حسین فلاحی)

سید امیر علی (۱۸۴۹ ــ ۱۹۲۸ء) کی تصنیف اسپرٹ آف اسلام سب سے پہلے ۱۸۹۱ء میں منظرِ عام پر آئی اس کا ترمیم شدہ عوامی ایڈیشن ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا۔ ایک اور اضافہ شدہ ایڈیشن ۱۹۲۲ء میں نکلا جس میں مسئلہ امامت اور اسلام کی متصوفانہ روح سے متعلق دو نئے ابواب کا اضافہ تھا، نیز تمہید اور حصہ دوم کے دسویں باب میں خاصا نیا مواد بھی شامل کیا گیا۔

یہ اولین تصنیف مستشرقین اور انگریزی طبقے کو رسول اکرم حضرت محمدؐ کی حقیقی زندگی اور تعلیمات سے واقف کرانے کی ایک غیر معمولی کوشش ہے۔ اس کتاب میں اسلام کی معقولیت اور اس کے اصول و مقاصد سے بھی بحث کی گئی ہے نیز اسلام کی ان گراں قدر خدمات کا بھی تذکرہ ہے جو اس نے گندے اخلاقی ماحول کو پاک وصاف کرنے نیز انسانیت کو اس کی پست ترین حالت سے اونچا اٹھانے کے سلسلے میں انجام دیا ہے۔

کتاب کے ایک حصہ میں رسول اکرمؐ کی سیرت اور حکومت کا بیان ہے ضمناً مسئلہ امامت پر بھی بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصہ میں اسلام کی تعلیمات کا ذکر ہے۔

پہلا حصہ دس ابواب میں منقسم ہے جبکہ اس سے قبل پچاس صفحات پر مشتمل ایک طویل تمہید بھی ہے جس میں فاضل مصنف نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کی اور ان کی معاصر مختلف اقوام کی مذہبی اور سماجی صورتِ حال کا جائزہ اس غرض سے پیش کیا ہے تاکہ اخلاقی سطح پر حضرت محمدؐ کی کامیابیوں کی صحیح قدر و قیمت معلوم ہو سکے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے اس طریقے پر گفتگو کی گئی ہے جس کے ذریعہ انسانوں کو مادہ پرستی کی پستی سے نکال کر خدا پرستی کی بلندی پر پہنچایا گیا۔ حق کی طرف بلانے کے لیے ہمیشہ خدا کی آواز اس کے خاص بندوں کے ذریعے سنی گئی ہے۔ امیر علی کہتے ہیں کہ یہ افراد ہی درحقیقت وہ آسمانی پیغامبر ہیں جو اپنی قوم میں عام بچوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں لیکن سچائی، پاکیزگی اور انصاف کی خاطر انسانوں کی دبی تمناؤں کی ترجمانی کرتے ہیں۔

> "اس سرزمین پر متعدد انبیا انسانی نفوس کا تزکیہ کرنے، ان کی اصلاح کرنے اور زوال پزیر اقوام کو اونچا اٹھانے کے لیے تشریف لائے۔ بعض انبیاء ایک مختصر قبیلہ کی تعلیم اور ایک محدود دائرہ کو متاثر کرنے کے لیے آئے اور بعض ایک عالمگیر پیغام کے حامل بن کر آئے ایسا پیغام جو کسی خاص انسانی نسل یا خاص خطۂ زمین تک محدود نہیں تھا۔ بلکہ پوری انسانیت کو محیط تھا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ایسے ہی پیغمبر تھے۔ وہ صرف عربوں کے پیغمبر نہ تھے اور نہ کسی خاص زمانہ یا ماحول کے لیے ان کی تعلیم تھی بلکہ تمام انسانوں کے لیے اور رہتی دنیا تک کے لیے وہ نبی بنا کر بھیجے گئے۔[۳۸]

اس کے بعد فاضل مصنف نے نہایت عمدہ انداز میں ان وجوہ و اسباب کا ذکر کیا ہے جن کی بنا پر حضرت محمدؐ کی بعثت کی ضرورت پیش آئی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کا معاشرہ اخلاقی اقدار سے بالکل عاری ہو چکا تھا اور ہر طرف فساد کا دور دورہ تھا جس کی بنا پر ایک معلم و مصلح کے ظہور کی ضرورت پیش آئی۔ اس عہد کی مذہبی اور سماجی صورت حال کی تصویر کشی مصنف نے ان الفاظ میں کی ہے :-

"زرتشت، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ نے جو شمع ہدایت روشن کی تھی اس کی لو انسانی خون سے بجھائی جا چکی تھی ایک بگڑی ہوئی زرتشتیت اپنے سے زیادہ بگڑی ہوئی عیسائیت سے برسرِ پیکار تھی اور اس جنگ و جدال نے انسانیت کی آواز کو دبا کر رکھ دیا تھا اور اس سرزمین کے خوشحال ترین علاقوں کو بھی لہو کی ندیوں میں بدل دیا تھا بالادستی کی خاطر مسلسل رزم آرائیوں دائمی خانہ جنگیوں اور مذہبوں اور فرقوں کی لگاتار چپقلشوں نے قوموں کا خون نچوڑ لیا تھا اور روئے زمین کے باشندے جو بے روح شیخ پرستی کی آہنی بوجھ کے تلے کچلے جا رہے تھے، خدا سے اپنے آقاؤں کے مظالم کی فریاد کر رہے تھے۔ دنیا کی تاریخ میں ایک نجات دہندہ کی اس سے زیادہ ضرورت کبھی پیش نہیں آئی تھی اور نہ کبھی اس کے ظہور کے لیے اس سے موزوں تر وقت آیا تھا۔"[۳۹]

جن وجوہ و اسباب سے دنیا کو ایک بڑے معلم کی ضرورت تھی ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس معلم اعظم کا ظہور، جس کی پیغمبرانہ زندگی قابلِ توثیق ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ نہ تو محض ایک حادثہ ہے اور نہ تاریخ عالم سے غیر مربوط کوئی واقعہ بعینہٖ وہی اسباب، وہی ہمینہ برائیاں اور کائنات میں جاری قدرت مطلقہ پر ایمان کے لیے وہی حقیقی داعیے جو قیصر آگسٹس کی حکومت میں، ایسے پیغمبر کے ظہور پر منتج ہوئے جس کی زندگی ایک المیہ کی حیثیت رکھتی ہے وہی اسباب و داعیات

ساتویں صدی عیسوی میں بڑی زبردست قوت کے ساتھ بروئے کار آئے[۱۵]

اس کے بعد مصنف نے اہل بابل واسیریا، ایرانیوں، ہندوستانیوں، یونانیوں، یہودیوں، عیسائیوں اور عربوں کی سماجی ومذہبی صورت حال پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

عربوں کے ذیل میں انھوں نے مختصراً ذوالقرنین پر بھی بحث کی ہے جن کی شخصیت کا تعین بڑی حد تک مشکل ہے مختلف مورخین کے نزدیک جن میں رازی بھی شامل ہیں قرآن میں مذکور "ذوالقرنین" مقدونیہ کے سکندر ہیں لیکن یہ خیال مختلف فیہ ہے۔ امیر علی کا خیال ہے کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین کا لقب یمن کے چند بادشاہوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے لیکن یہ خیال بھی محل نظر ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحقیق یہ ہے کہ یہ لقب ایران کے مشہور بادشاہ سائرس پر صادق آتا ہے[۱۶] مولانا مودودیؒ بھی اسی رائے کے حامی معلوم ہوتے ہیں[۱۷]۔

مولانا آزادؒ نے اپنی کتاب اصحاب کہف میں اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ سائرس ہی قرآن کے ذوالقرنین کا مصداق ہے۔ ان کے خیال کی بنیاد یسعیاہ اور یرمیاہ کی پیشین گوئیاں (۲۹: ۱۰ — ۵۰: ۲) دانیال نبی کا خواب، (۸: ۱-۷، ۲۰) ۱۸۳۶ء کی ایک تحقیقی رپورٹ اور وہ اسٹیچو ہے جو استخر ISTAKHR (Persepolis) کے کھنڈرات سے برآمد ہوا ہے جس میں سائرس کو دو سینگوں والا دکھایا گیا ہے۔ مولانا آزاد کے نزدیک ان کی دو سینگوں سے مراد MEDIA اور PERSIA کی بادشاہت ہے۔ اس طرح ذوالقرنین جو سائرس کا محبوب لقب تھا اسے میڈیا اور پرشیا کا حکمراں ثابت کرتا ہے۔ سائرس اپنے اس لقب سے یہودیوں میں بھی مشہور تھے جو انھیں اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ (یرمیاہ ۲۹: ۱۰) انھوں نے پیغمبر EZRA (۱: ۲) کی بنیاد پر لکھا ہے کہ سائرس ایک انصاف پسند، صادق القول اور خداترس انسان کے ساتھ ساتھ پیغمبر بھی تھے[۱۸]۔ مولانا کے بقول سائرس ہی نے وہ تین بڑی فتوحات حاصل کیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے اور یاجوج ماجوج کی فساد انگیزی کی روک تھام کے لیے ایک دیوار بھی تعمیر کی[۱۹]۔

زیر تبصرہ کتاب کے پہلے حصہ میں دس ابواب ہیں جن میں سے نو رسول اکرمؐ کی سیرت پر ہیں۔ ان میں مصنف نے، جو بجا طور پر رسول اکرم کے اہم سوانح نگاروں میں شامل ہونے کے مستحق ہیں، رسولؐ کی زندگی کے ہر پہلو پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے اور ان کی حقیقی زندگی لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔

پہلے باب میں قصی، قریش کی سرداری، پیغمبر کی ولادت، ان کا بچپن، ان کی پرورش،

شام کا سفر حضرت خدیجہ سے شادی، وحی کا نزول، دین کی تبلیغ، صحابہ کی قربانیاں، قریش کی دشمنیاں آپ کے پیروکاروں پر کیے جانے والے مظالم اور سالِ غم (عام الحزن) کا بیان ہے۔

دوسرے باب میں عقبہ اولیٰ و عقبہ ثانیہ کا بیان اور ۶۲۲ء میں آپؐ کی ہجرت مدینہ کا ذکر ہے اسی باب میں واقعہ معراج پر بھی مختصر بحث ملتی ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ یہ واقعہ خواب کا ہے۔ مصنف کا یہ خیال ناقابل اعتبار معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ واقعہ بیداری کی حالت میں پیش آیا ہے جس پر سورہ بنی اسرائیل کی ابتدائی آیت کا لفظ "عبد" دلیل ہے[۱۲] اگر یہ واقعہ خواب میں پیش آیا ہوتا یا اس وقت اسے ایسا سمجھا جاتا تو مکہ کے کافروں کے انکار و تکذیب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ خواب میں، پیغمبر خدا کا معاملہ تو جدا ہے، ایک عام پرہیزگار انسان کو بھی اس طرح کی چیزیں نظر آتی ہیں۔

تیسرا باب جو مختصر ترین ہے مدینہ کی تاریخ اور مدینہ میں رسولؐ کی مصروفیت کا حال بیان کرتا ہے۔

چوتھے باب میں قریش اور یہودیوں کی اس دشمنی کا ذکر ہے جو انھیں مسلمانوں سے تھی، اس چارٹر کا بیان ہے جو رسول اکرمؐ نے یہودیوں کو دیا تھا۔ اس کے ساتھ جنگ بدر اور اس میں مسلمانوں کی فتح کا ذکر ہے۔

پانچویں باب میں مصنف نے متعدد غزوات و سرایا مثلاً غزوۂ سویق، غزوہ احد، قریش کی سفاکی، یہودیوں کا عناد اور ان کی غداری مدینہ سے بنو قینقاع اور بنو نضیر کی جلاوطنی اور اس کے اسباب نیز بنو قریظہ کی تادیبی کارروائی کا ذکر کیا ہے۔

رسول کریمؐ کے عیسائی سیرت نگار مثلاً ولیم میور، اسپرنگر، ویل، آسبرن وغیرہ نے آپؐ کی ذات پر اور اسلام پر ظلم و سفاکی کے اتہامات لگانے کی پوری کوشش کی ہے۔ بنو قریظہ کو یہ سزا دی گئی تھی کہ ان کے تمام قابلِ جنگ افراد قتل کر دیے گئے ان کے بچے اور عورتیں غلام اور باندیاں بنائے گئے۔ یہ ان بعض واقعات میں سے ایک ہے جن کی بنا پر وہ اس طرح کے حملے اسلام اور پیغمبر اسلام پر کرتے ہیں۔ امیر علی نے اس سزا کو انصاف پر مبنی قرار دیتے ہوئے درج ذیل دلائل دیے ہیں۔

(۱) انھیں یہ سزا سعد بن معاذ کی تجویز کی بنا پر دی گئی جنھیں انھوں نے اپنا حکم تسلیم کیا تھا۔

(۲) یہ سزا اس زمانے کے قوانین جنگ کے عین مطابق تھی۔ یہودیوں کے بشمول مختلف

اقوام عالم میں اس طرح کی سزائیں رائج تھیں۔

(۳) بنو قریظہ اس بات سے اچھی طرح باخبر تھے کہ ان کے قبیلے کے ایک فرد سعد کا فیصلہ مسلمہ قوانین کے برخلاف نہ تھا اسی لیے اس پر اعتراض بھی نہیں ہوا۔[۳۱]

مصنف کے اس خیال کی تائید علامہ شبلی کی تصنیف سیرت النبی جلد اول سے ہوتی ہے جس میں انھوں نے اس سزا کو عہدنامہ عتیق کے قوانین کے عین مطابق قرار دیا ہے (استثناء ۲۰: ۱۰—۱۲)[۳۲] علامہ شبلی نے اس کی صراحت بھی کی ہے بعض مخصوص معاملات میں آنحضرت کا طرز عمل یہ تھا کہ جب تک اللہ کی طرف سے کوئی واضح ہدایت نہیں ملتی۔ آپ توریت کے قوانین ہی پر عمل کرتے تھے۔ اس کی متعدد مثالیں ہیں جیسے بیت المقدس کو قبلہ بنانا، رجم و قصاص کی سزائیں وغیرہ[۳۳]۔ اس بحث کے اختتام پر مصنف نے اس کہانی کی تردید کی ہے کہ بنو قریظہ کے باقی ماندہ افراد کی تقسیم میں ریحانہ نام کی ایک نوجوان یہودیہ آپ کو دی گئی۔ وہ اس قصہ کو جعل سازی قرار دیتے ہیں۔ ان کی یہ دلیل معقول معلوم ہوتی ہے کہ اس واقعہ کے بعد تاریخ میں ریحانہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا جبکہ دوسروں کے تفصیلی حالات بھی معلوم ہیں[۳۴]۔ علامہ شبلی نے بھی سیرت النبی میں اس قصہ کو جھوٹا قرار دیا ہے۔ ان کی تحقیق حافظ ابن مندہ کی روایت پر مبنی ہے۔

چھٹے باب میں سینٹ کیتھرائن کے راہبوں کے لیے آپ کے معاہدے کا ذکر ہے، صلح حدیبیہ کا بیان ہے۔ ہرقل اور خسرو پرویز کے نام آپ کے دعوت ناموں کا ذکر ہے عیسائیوں کے ذریعہ مسلم سفیروں کے قتل کا حال بیان ہوا ہے۔

رسول اکرمؐ کے عیسائی سیرت نگاروں نے اسلام کو ظلم و جبر کا مذہب بنا کر پیش کیا ہے۔ فاضل مصنف نے اس الزام کی بھرپور تردید کرتے ہوئے رسول اکرم کے ان فرامین کے حوالے دیئے ہیں جو عیسائیوں کے لیے آپ نے جاری فرمائے تھے۔

اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اس دستاویز کی رو سے عیسائیوں کو چند ایسی استثنائی مراعات حاصل ہوئیں جو انھیں اپنے ہم مذہب حکمرانوں کے تحت بھی نصیب نہ ہوئی تھیں۔ آنحضرت نے اعلان کر دیا کہ اس دستاویز میں جو احکام مندرج ہیں اگر کوئی مسلمان ان کی خلاف ورزی کرے گا یا ان سے ناجائز فائدہ اٹھائے گا تو اسے معاہدہ الٰہی سے روگردانی کرنے والا، اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والا اور اس

کے دین کی تبدیلی کرنے والا تصور کیا جائے گا۔ آپ نے عیسائیوں کی حفاظت ان کے گرجاؤں اور ان کے پادریوں کے مکانوں کی پاسبانی اور انھیں ہر طرح کے گزند سے بچانے کی ذمہ داری اپنی ذات پر بھی اور اپنے متبعین پر بھی عائد کی عیسائیوں سے یہ وعدہ کیا گیا کہ ان پر کوئی ناجائز ٹیکس نہ لگائے جائیں گے، ان کا کوئی پادری اپنے علاقے سے نہ نکالا جائے گا، کسی عیسائی کو اپنا مذہب ترک کرنے پر مجبور نہ کیا جائے گا کسی راہب کو اس کے راہب خانے سے خارج نہ کیا جائے گا اور نہ کسی زائر کو سفر زیارت سے روکا جائے گا۔ ان کو اس کی بھی ضمانت دی گئی کہ مسجد یا مسلمانوں کے رہنے کے مکان کے لیے کوئی گرجا مسمار نہ کیا جائے گا جن عیسائی عورتوں نے مسلمانوں سے شادی کر رکھی تھی ان کو یقین دلایا گیا کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہنے کی مجاز ہوں گی اور اس بارہ میں ان پر کوئی جبر و اکراہ نہ کیا جائے گا۔ اگر عیسائیوں کو اپنے گرجاؤں یا خانقاہوں کی مرمت کے لیے یا اپنے مذہب کے کسی اور امر کے بارے میں امداد کی ضرورت ہوگی تو مسلمان انھیں امداد دیں گے۔[۱۱]

اپنے بیان کی مزید توضیح کے لیے وہ یہ فرماتے ہیں کہ پیغمبرؐ کی شخصیت میں انصاف اور جذبہ رحم کے دو ایسے اوصاف ہیں جن سے اعلیٰ اوصاف کا تصور بھی مشکل ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سربراہِ حکومت اور انسانی حیات و آزادی کے محافظ کی حیثیت سے انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی خاطر مجرموں پر سزاؤں کے نفاذ میں بہت سخت تھے۔ لیکن وہی پیغمبر جو معلم تھے اپنے بدترین دشمنوں کے لیے بھی انتہائی شریف اور رحمدل تھے۔ اس کے ثبوت میں مصنف نے وہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے غیر مشروط طریقے پر ان قاتلوں کو معاف کر دیا جنھوں نے ان کی بھتیجی صاحبزادی کو صلح حدیبیہ کے بعد مکہ سے مدینہ کو ہجرت کرتے ہوئے قتل کر دیا تھا۔[۱۲] اس کے علاوہ آپؐ کی وہ ہدایات جو دشمنوں کی طرف بھیجی جانے والی مہمات کے قائدین کو دی جاتی تھیں اس حقیقت کی بین ثبوت ہیں کہ آپؐ تشدد یا جبر و اکراہ کے مخالف تھے اور یہی نہیں کہ آپ نے عفو و درگزر کی صرف تعلیم دی ہو بلکہ عملاً اسے برت کر دکھایا بھی ہے۔ ان قابل ذکر ہدایات میں سے وہ ہدایات بھی ہیں جو انھوں نے مجاہدین کو بازنطینی سلطنت کی طرف جاتے ہوئے دی تھیں۔ ان ہدایات کے الفاظ یہ تھے:-

"بے ضرر، خانہ نشین لوگوں کو مت چھیڑنا، عورتوں پر ہاتھ نہ اٹھانا، شیر خوار بچوں کو زخمی مت کرنا اسی طرح بیماروں کو بھی تکلیف مت پہنچانا۔ جو تم سے جنگ نہ کریں ان کے گھروں کو نقصان نہ پہنچانا۔ ان کے ذرائع معاش کو تباہ مت کرنا اور نہ ہی ان کے پھلدار درختوں کو کاٹنا اور کھجور کے درختوں کو مت چھونا۔"[۲۲]

اسی سیاق میں مصنف نے آنحضور کے خلیفہ اول حضرت ابوبکر کی وہ ہدایات بھی درج کی ہیں جو انھوں نے یزید بن ابوسفیان کو دی تھیں:۔

"اے یزید! جب تمہارا سامنا دشمنوں سے ہو تو بہادروں کی طرح مقابلہ کرنا اور پیٹھ مت پھیرنا اگر تمہیں فتح نصیب ہو تو بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل مت کرنا۔[۲۳] کھجور کے درخت مت کاٹنا، اناج کی فصل برباد مت کرنا۔ کسی پھلدار درخت کو نہ کاٹنا اور مویشیوں کو نقصان نہ پہنچانا ان چیزوں سے صرف اس حد تک حاصل کر لینے کی اجازت ہے جس سے اپنی ضرورت پوری ہو سکے جب تم کوئی معاہدہ کرو تو اس پر قائم رہو اور اپنا وعدہ پورا کرو۔ جب تم آگے بڑھو گے تو تمہیں کچھ ایسے دیندار لوگ ملیں گے جو خانقاہوں میں رہتے ہیں انھوں نے خدا کی بندگی کا یہی طریقہ اختیار کر لیا ہے ان سے تعرض نہ کرنا۔ انھیں قتل نہ کرنا اور نہ ان کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنا۔"[۲۴]

ساتویں باب میں غزوہ خیبر، عمرۃ القضا، اہل مکہ کی معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی فتح مکہ اور مسلمانوں کے شریفانہ سلوک کا بیان ہے۔

آٹھویں باب میں، مدینہ کو آنے والے وفود، ایک یونانی دخل اندازی کی روک تھام، غزوہ تبوک، عروہ کا اسلام لانا اور ان کی شہادت، بنوطی کا قبول اسلام، کعب بن زہیر کا قبول اسلام اور نبی کی شان میں ان کے مدحیہ قصیدوں کا ذکر ہے۔

نویں باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عقلی و فکری اسلوب، عرفات سے دئے گیے آپ کے وعظ کا ذکر ہے، عمال کے نام آپ کی ہدایات ہیں، جھوٹے مدعیان نبوت کا ذکر ہے۔ آپؐ کی آخری علالت، وفات اور آپ کی مقدس سیرت کا ذکر ہے۔

دسواں باب۔ رسولؐ کی نیابت (مسئلہ امامت) کے مسئلہ پر بحث کے لیے مخصوص ہے جو مسلمانوں کے دو بڑے فرقوں شیعہ اور سنی کے درمیان ایک نزاعی مسئلہ ہے۔ اس باب

کے ابتدائی پیراگراف میں مصنف نے لکھا ہے کہ "یہ بات عقیدہ کا حصہ سمجھی جاتی تھی کہ جب کوئی عبادت کرتا ہے تو اس وقت پیغمبرؐ کی روح وہاں موجود رہتی ہے"[۴۵] لیکن یہ بیان اسلامی اصولوں کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ عبادت کے وقت پیغمبر کی روحانی موجودگی کو کبھی بھی عقیدہ کا حصہ نہیں سمجھا گیا۔

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اہل سنت یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے نجات دہندہ کا ابھی تک ظہور نہیں ہوا ہے، مصنف نے اس عقیدہ کی ابتدا کا سراغ زردشتیوں کے یہاں سے لگایا ہے۔ جو خدائی مبعوث و نجات دہندہ "سیوشں" کے ظہور کے منتظر تھے۔ مصنف کے بیان سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ مسیح موعود (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی آمد پر یقین نہیں رکھتے۔ لیکن نزول مسیح کے بارے میں رسول اکرمؐ کی جو احادیث ہیں وہ ان کے اس خیال کی تغلیط کے لیے کافی ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ مسیح اس دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے اور دمشق کے مقام پر دجال سے مقابلہ کریں گے اس کے فتنوں کا خاتمہ فرمائیں گے اور بالآخر اسے بھی قتل کردیں گے۔[۴۶]

کتاب کے دوسرے حصہ میں گیارہ ابواب ہیں پہلے باب میں دوسری باتوں کے علاوہ اسلام کے اخلاقی اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔ انھوں نے قرآن کی متعدد آیتوں اور احادیث سے اسلام کو انسانیت کا دین ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے، اور غریبوں، محتاجوں، یتیموں، پڑوسیوں اور غلاموں کی خبر گیری کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا، ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرنے، انصاف سے کام لینے، اور زنا اور بدکاری سے بچنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام جانوروں کے حقوق کی ادائیگی کا بھی حکم دیتا ہے۔ اس لیے کہ خالق کی نگاہ میں ان کی زندگی بھی انسانوں کی زندگی کی طرح ہے، قرآن کہتا ہے کہ زمین پر چلنے والا کوئی چوپایہ یا فضا میں پرواز کرنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں ہے جو تمہاری طرح ایک امت نہ ہوں وہ سب اپنے خدا کی طرف لوٹیں گے۔[۴۷] نبی کریمؐ نے فرمایا، "جانوروں کے بارے میں خدا سے ڈرو، ان پر ایسی حالت میں سواری کرو جب وہ اس قابل ہوں اور جب وہ تھک جائیں تو ان سے اتر جاؤ۔ یقین جانو کہ بے زبان جانوروں سے اچھا سلوک کرنے اور انھیں پانی پلانے کا بھی اجر ملتا ہے۔[۴۸]

دوسرا باب اسلام کی مذہبی روح سے متعلق ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ اس روح کی

بقا کے لیے رسول اکرمؐ نے چند بنیادی فرائض مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج مسلمانوں پر لازم فرمائے۔

تیسرے باب میں اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو ہے کہ مختلف اقوام میں آخرت کی زندگی کے تصورات کیا ہیں اور خود مسلمانوں کا عقیدہ کیا ہے۔ مصنف نے ابتدا میں مصریوں، زرتشتیوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے تصورات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد اسلام جس مستقبل کی زندگی کا تصور دیتا ہے اس کی وضاحت کی ہے اور قرآن میں مذکور جزا و سزا کے تصور کی صراحت بھی کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں لائق مصنف نے اس اعتراض کا جائزہ لیا ہے کہ "اسلام ظلم و جبر کا دین ہے" اور اس کی اشاعت و ترقی تلوار کے ذریعہ عمل میں آئی ہے۔ انھوں نے اس اعتراض کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام جبر و تشدد کا مخالف ہے اس نے تحمل و صبر کی تلقین کی ہے۔ اس کی اشاعت کا راز ان عظیم تعلیمات میں پنہاں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی (جائز) نہیں"۔ مصنف کا خیال ہے کہ وہ تمام جنگیں جو مشرکین مکہ، ایرانیوں اور بازنطینیوں کے خلاف لڑی گئیں خالص دفاعی اغراض کے تحت تھیں۔ جب مشرکین مکہ نے مدینہ پر چڑھائی کی اور مسلمانوں کی جانوں کو خطرہ لاحق ہوا اس وقت اللہ نے انھیں اپنے دفاع میں تلوار اٹھانے کی اجازت دی۔ اسی طرح یہودیوں کو جو سزائیں دی گئیں وہ سب کی سب اس لیے منصفانہ تھیں کہ انھوں نے بار بار غداریاں کیں اور معاہدوں کی خلاف ورزیاں کرتے رہے۔ اسی ضمن میں انھوں نے ولیم میور کے اس اعتراض کا جواب بھی دیا ہے کہ "اسلام جارحیت کا دین ہے" اور اس کی بقا کے لیے ناگزیر ہے کہ غارت گری کا سلسلہ جاری رکھا جائے اور تلوار کی قوت سے اس کے ادعائے تفوق کو ثابت کر دیا جائے۔ امیر علی لکھتے ہیں:۔

> "اسلام نے صرف اپنے تحفظ کی خاطر تلوار نیام سے نکالی اور اپنے تحفظ ہی کی خاطر اسے اپنے ہاتھ میں رکھا اور وہ ہمیشہ ایسا کرے گا۔ لیکن اسلام نے کبھی کسی مبنی بر اخلاق مذہب کے اعتقادات و یقینیات میں دخل اندازی نہیں کی، اس نے کبھی تشدد سے کام نہیں لیا، اس نے کبھی کوئی مجلس مواخذہ قائم نہیں کی اس نے اختلاف رائے کو دبانے، انسانی ضمیر کا گلا گھونٹنے یا بدعت کا قلع قمع کرنے کے لیے کوئی تعذیبی شکنجہ ایجاد نہیں کیا۔"[۲۹]

اس کے برعکس عیسائیت کا الزام یہ ہے کہ اسلام عدم رواداری کا مبلغ ہے جو اظہار رائے

اور عبادت کی آزادی کی اجازت نہیں دیتا۔ مصنف نے عیسائیت کی عدم رواداری، ظلم و جبر اور مذہبی دیوانگی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"عیسوی کلیسا نے معصومیت کے دعویٰ کے باوجود تاریخ انسانی کے تمام اداروں سے بڑھ کر معصوموں کا خون بہایا ہے۔ جس مرد یا عورت نے کلیسا سے انحراف کیا یا کسی اور مذہب کو عیسائیت پر ترجیح دی تو اسے ایسی سزا ملی جو انتہائی ظالمانہ تھی۔ ۱۵۲۱ء میں چارلس پنجم نے تمام اہل بدعت کے لیے موت اور قرقی املاک کا فرمان جاری کیا۔ شرکت عشائے ربانی سے انکار کی عمومی سزا، آگ میں زندہ جلانا، پھانسی پر لٹکانا، زبان کا گدی سے نکالنا، تھی۔ جب انگلستان نے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کیا تو یکے بعد دیگرے متعدد حکمرانوں کے عہد میں پریسبیٹرینوں (Presbyterians) کو قید کیا گیا، گرم لوہے سے داغا گیا، اپاہج بنایا گیا، انھیں کوڑے مارے گئے اور شکنجوں میں کس کر ان کی تشہیر کی گئی۔ اسکاٹ لینڈ میں فراری مجرموں کی طرح ان کا شکار کیا گیا، ان کے کان جڑ سے کھینچ لیے گئے۔ انھیں گرم لوہوں سے داغا گیا، آہنی اوزار سے ان کی انگلیاں توڑی گئیں، بوٹوں سے ان کے پیروں کی ہڈیاں چور کر دی گئیں، عورتوں کو سربازار کوڑے لگائے جاتے۔ کیتھولک عیسائیوں کو اذیتیں پہنچائی گئیں اور انھیں پھانسیاں دی گئیں، انابپٹسٹوں (Anabaptists) اور ایرین (Arians) کو زندہ نذرِ آتش کیا گیا۔ یہ تو عیسائی فرقوں کے باہمی سلوک کا حال تھا۔ رہے غیر عیسائی تو ان کے معاملے میں کیا کیتھولک اور کیا پروٹسٹنٹ کیا مقلد اور کیا غیر مقلد سب میں مکمل اتفاق رائے تھا۔ مسلمان اور یہودی عیسائیت کے دائرے سے، یعنی انسانیت کے دائرے سے خارج تھے۔ انگلستان میں یہودیوں کو عذاب کا تختۂ مشق بنایا گیا اور پھانسیاں دی گئیں، اسپین میں مسلمانوں کو زندہ جلایا گیا۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان عیسائیوں اور کافروں کے درمیان، شادیاں قانوناً کالعدم شمار ہوتی تھیں بلکہ ممنوع تھیں۔ اور ایسے لوگوں کے لیے حد درجہ گھناؤنی اور بھیانک سزائیں مقرر تھیں۔ آج بھی عیسائی امریکہ اس عیسائی نیگرو کو زندہ جلا دیتا ہے جو کسی سفید فام

عورت سے شادی کرے۔ یہیں عیسائیت کے اثرات ونتائج ہیں[۵۴]

اس باب کے آخر میں مصنف نے صلیبی جنگ جویوں اور مسلمان مجاہدوں کے طرز عمل کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جب خلیفہ عمرؓ نے ۶۳۷ء میں یروشلم فتح کیا تو وہ سوفرونیس پادری کے ساتھ شہر کے آثار قدیمہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے جب آپ Church of Resurrection میں تھے اسی دوران نماز کا وقت ہوگیا آپ کو وہاں نماز کی ادائیگی کی پیشکش کی گئی مگر انھوں نے اسے منظور نہ کیا اور کلیسائے قسطنطین کی سیڑھیوں پر نماز ادا کی۔ اپنے اس عمل کی توجیہ انھوں نے یہ کی کہ آج اگر میں اس پیشکش کو قبول کر لیتا تو اس کا امکان تھا کہ مستقبل میں مسلمان میری مثال کی تقلید کرنے کے بہانے اس معاہدہ کو منسوخ کر ڈالتے۔ لیکن جب عیسائیوں نے یروشلم کو فتح کیا تو انھوں نے بچوں کے سروں کو دیواروں پر دے مارا، شیر خوار بچوں کو قلعہ کی فصیلوں پر سے نیچے پھینک دیا، آدمیوں کو آگ میں بھون ڈالا گیا۔ کچھ لوگوں کے پیٹ بھی چاک کر ڈالے گئے جس سے یہ دیکھنا مقصود تھا کہ کہیں انھوں نے سونا نہ نگل لیا ہو، یہودی اپنے معبدوں میں بند کر کے جلا ڈالے گئے اس طرح تقریباً ستر ہزار افراد قتل کیے گئے اور پاپائے روم کے ایلچی نے اس قتل عام کے جشن میں شرکت فرمائی۔ دوسری طرف جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے یروشلم پر دوبارہ فتح حاصل کی تو اس نے تمام عیسائیوں کو رہا کر دیا انھیں رقوم اور غذا فراہم کی اور ان کی بحفاظت روانگی کا بندوبست فرمایا۔"[۵۵]

فاضل مصنف کا یہ تبصرہ کتنا منصفانہ ہے کہ اسلام نے تو اپنے دفاع کی خاطر تلوار سنبھالی تھی مگر عیسائیت نے دوسروں کی آزادیٔ رائے اور آزادی مذہب پر قدغن لگانے کی خاطر تلوار اٹھائی۔

پانچویں باب کو "اسلام میں عورتوں کی حیثیت" کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ اس میں مصنف نے اور باتوں کے علاوہ اقوام ماضیہ میں رائج تعدد ازدواج اور طلاق کے مسائل سے بحث کی ہے نیز ان امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نافذ کردہ اصلاحات کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے علاوہ خود رسول اکرم کی شادیوں اور ان کے اسباب پر بھی گفتگو کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ رسول اکرم

نے عورتوں کی حیثیت کو بلند کرنے میں کتنی کامیاب کوششیں کیں، ماضی کی قوموں میں تعدد ازدواج کے رواج پر گفتگو کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ مشرقی اقوام میں تو اس کو ایک معروف شے کا درجہ حاصل تھا۔ ہندوؤں میں بالکل ابتدا ہی سے اس کا رواج تھا۔ ان کے ہاں تو بیویوں کی کوئی تعداد بھی متعین نہیں تھی۔ ایک آدمی جتنی بیویاں بیک وقت رکھنا چاہے رکھ سکتا تھا۔ آج بھی ایک اونچی ذات کا برہمن اس معاملہ میں خود مختار ہے۔[۵۳] ایرانیوں کے یہاں ایک سے زیادہ شادی مذہبی اعتبار سے قابل انعام اقدام قرار دی جاتی تھی۔[۵۴] ان کے نزدیک شادی کا باضابطہ کوئی قانون بھی نہیں تھا اور اگر کبھی کوئی قانون رہا بھی ہو تو وہ نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ ژند اوستا میں اس طرح کا کوئی ضابطہ موجود نہیں ہے کہ ایک آدمی بیک وقت کتنی بیویاں رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ ایرانیوں کے ہاں مسلسل شادیاں کرنے کا ایک رواج چل پڑا جبکہ ان میں سے ہر ایک کے پاس داشتاؤں کی بھی خاصی تعداد ہوتی تھی۔[۵۵]

تھریس، میڈیا اور پیلاسگیا Pelasgia کی قوموں میں، جو یورپ اور مغربی ایشیا کے مختلف حصوں میں آباد تھیں، تعدد ازدواج کا رواج اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ اس دور میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اہل ایتھنز کے یہاں بیوی محض ایک اثاثہ تھی جس کی خرید و فروخت اور تبادلہ بھی جائز تھا۔ اسی طرح وصیت کے ذریعہ اس کی منتقلی بھی درست تھی۔ وہ بیویوں کی تعداد کے معاملہ میں کسی حد کے پابند نہیں تھے۔[۵۶] اہل اسپارٹا میں تو عورتوں کی حالت مزید خراب تھی۔ وہاں صرف مخصوص حالات ہی میں تعدد ازدواج کی اجازت تھی مگر عورتیں بیک وقت متعدد شوہر رکھ سکتی تھیں اور وہ ہمیشہ اس اجازت سے فائدہ اٹھاتی تھیں۔[۵۷]

رومی معاشرے میں عورتوں کا درجہ بہت پست تھا۔ ان کے یہاں بھی ایک سے زیادہ شادیاں کرنا اور داشتائیں رکھنا ایک عام سی بات تھی اسے غیر قانونی تو بہر حال نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مصنف نے لکھا ہے کہ عورتوں کی بے قید آزادی، مردوں کے ساتھ ان کا ڈھیلا ڈھالا رشتہ بیویوں کے کثیر الوقوع تبادلے تعدد ازدواج ہی کی شکلیں ہیں گرچہ انھیں اس نام سے موسوم نہیں کیا گیا۔[۵۸] عام لوگوں کی بات تو جدا ہے وہاں کے بادشاہ بھی ایک سے زیادہ شادیاں کیا کرتے تھے۔ قسطنطین Coustantine (۲۷۴—۳۲۸) اور اس کے بیٹے کی متعدد بیویاں تھیں۔ Valentenian II نے اسے قانونی حیثیت دے دی کہ اس کی مملکت کے تمام شہری جو ایک سے زیادہ شادیاں کرنا چاہتے ہوں ایسا کر سکتے ہیں۔ اور اس قانون پر پیشانی

کلیسا کے سربراہوں اور بشپ (یہودی پادریوں) کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔[۳۵] نتیجہ کے طور پر بعد کے تمام حکمرانوں نے تعدد ازدواج پر عمل کیا اور شہریوں نے بھی اپنے حکمرانوں کی تقلید کی۔ یہاں تک کہ پادریوں نے بھی اپنی متجردانہ زندگی کو خیرباد کہہ کر ایک سے زیادہ قانونی یا غیر قانونی شادیاں شروع کردیں۔[۳۶] اس قانون کو Justinian (۴۸۳ — ۵۶۵) نے ممنوع قرار دے دیا۔ لیکن اس ممانعت سے عوام کے اخلاقی تصورات و خیالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی اور تعدد ازدواج کی یہ رسم اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ جدید معاشرہ کی نگاہ میں یہ ایک معیوب شے نہیں بن گئی۔

مشرقی یورپ کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ وہاں بھی یہ رسم جاری تھی۔ مصنف کہتے ہیں کہ وہاں کے بادشاہوں نے ایک سے زائد بیویاں رکھنے کی مثال قائم کی اور عوام نے بھی ان کی پیروی کی۔ یہاں تک کہ پادری بھی جنہیں کلیسا نے تجرد کی زندگی کی ہدایت کی تھی محض بشپ یا اپنے Diocese کے سربراہ سے حاصل کردہ اجازت کی بنا پر متعدد منکوحہ بیویوں سے مستفید ہونے لگے۔[۳۷]

اسرائیلیوں یا یہودیوں میں تو حضرت موسیٰ کی آمد سے قبل ہی سے یہ رسم عام تھی۔ حضرت موسیٰ نے اسے قائم رہنے دیا یہاں تک کہ متن نے اس کی کوئی حد مقرر نہ کی کہ ایک مرد بیک وقت کتنی عورتوں کو نکاح میں رکھ سکتا ہے۔[۳۸] حضرت داؤد اور سلیمان نے بھی متعدد عورتوں سے شادی کی۔ قدیم یہودیوں کے یہاں متعدد بیویوں کے علاوہ مشروط اور عارضی شادیوں کا بھی رواج تھا۔[۳۹] بعد کے زمانے میں یروشلم کے تلمود نے یہ پابندی عائد کی کہ ایک مرد صرف اتنی عورتوں کو اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے جتنی عورتوں کو نان و نفقہ مہیا کرنے کی اس میں استطاعت ہو۔ اگرچہ ربیوں کی ہدایت یہ تھی کہ کسی شخص کو چار سے زیادہ بیویاں نہیں رکھنی چاہئیں لیکن قرائین Karaites کو ان سے اختلاف تھا وہ اس معاملہ میں کسی حد بندی کے قائل نہ تھے۔[۴۰] یہودی لڑکی اپنے باپ کے گھر میں بھی ایک نوکرانی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اگر اس کا باپ چاہے تو سن بلوغ سے پہلے اسے بیچ بھی سکتا تھا، باپ کی موت کے بعد بیٹے اسی طرح اپنی بہنوں پر تصرف کا حق رکھتے تھے۔[۴۱] کسی مرد وارث کی موجودگی میں بیٹی کو وراثت کا ادنیٰ حصہ بھی نہیں ملتا تھا۔[۴۲]

مصنف کے بقول بدوی عربوں کے یہاں بھی تعدد ازدواج کی رسم جاری تھی۔ یہودیوں

کی طرح ان کے یہاں بھی مشروط اور عارضی نکاحوں کی اجازت تھی۔ ان بدویوں کا عورتوں کے ساتھ رویہ اتنا خراب تھا کہ وہ اپنی بچیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے اور یہ ان کی نگاہ میں کوئی جرم نہ تھا۔ یہ غیر انسانی حرکت قریش اور کندہ کے قبیلوں میں زیادہ پائی جاتی تھی۔ شہری عرب، جو اپنے آس پاس کی انحطاط یافتہ و فاسد مملکتوں سے متاثر تھے، عورتوں کو محض ایک اثاثہ کی حیثیت دیتے تھے۔ عورت اپنے شوہر یا اپنے باپ کی جائداد کا ایک ناگزیر حصہ سمجھی جاتی تھی اور ایک شخص کی بیوہ وراثت کے مال کی طرح اس کے بیٹے کی ملک بن جاتی تھی[۱۰] اس کے علاوہ دو بہنوں سے بیک وقت شادی بھی جائز متصور تھی، مصنف نے لینارمونٹ کی کتاب "مشرق کی قدیم تاریخ" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یمن کے نیم یہودیوں اور نیم صابی قبیلوں میں تو ایک عورت بیک وقت کئی شوہر رکھنے کی مجاز تھی[۱۱]۔

جس وقت رسول اکرم مبعوث ہوئے اس وقت عورتوں کی حالت ایسی کچھ خراب وخستہ تھی، ان کی اس پست حالت کو دیکھ کر آپ تلملا گئے اور انھوں نے عورتوں کو اس قابل رحم حالت سے نکالنے کا تہیہ کر لیا۔ انھوں نے بچیوں کو زندہ دفن کرنے کی ممانعت فرما دی اور اس حرکت پر متعدد سزائیں مقرر فرمائیں۔ انھوں نے عربوں میں جاری اس رسم کا بھی خاتمہ فرمایا کہ بیوں کو بتوں کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا۔ انھوں نے مشروط شادیوں کی رسم بھی موقوف کر دی اور یہی حال عارضی شادیوں کا بھی ہوا کہ ابتدا میں بعض مصالح کے تحت اس کی اجازت دی گئی تھی مگر ہجرت کے تیسرے سال اسے بھی ممنوع قرار دے دیا گیا[۱۲]۔ سوتیلی ماؤں کے ساتھ شادیاں ناجائز قرار دی گئیں[۱۳] اسی طرح بیک وقت دو بہنوں سے شادی کو بھی حرام ٹھیرایا گیا[۱۴]، لڑکیوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ باپ کی وراثت کا حق دار بنایا۔ اس طرح آپؐ نے عورتوں کو تمام اختیارات و فرائض کے معاملے میں قانونی طور پر مرد کے مساوی درجہ عطا فرمایا[۱۵]۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ آپؐ نے عورتوں کے احترام کو ایمانی تقاضوں کا ایک اہم جز قرار دیا اور فرمایا کہ جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے۔

جہاں تک تعدد ازواج کا سوال ہے حضرت محمدؐ کے عہد میں اس کا رواج جس طرح عربوں میں تھا ان کے پڑوسی ممالک و اقوام میں بھی یہ رسم رائج تھی۔ آپؐ کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے لامحدود شادیوں پر حد بندی عائد کی اور متعدد بیویوں کے درمیان ہر اعتبار سے مساویانہ سلوک کی شرط عائد کر کے اس رسم ہی کو محدود کر دیا[۱۶]۔ قرآن ایک وقت میں صرف چار عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ غذا، لباس اور رہائش کے معاملہ میں ان سب کے ساتھ

مساویانہ سلوک کرے ان میں سے کسی کو نظر انداز نہ کرے اور نہ شک وشبہ میں مبتلا کرے اور اگر وہ ایسا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تو وہ ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے۔ (۱۲۹ و ۳:۴) تعدد ازواج کے بارے میں مصنف کی اپنی ذاتی رائیں درج ذیل ہیں:

(۱) اس ضمن میں قرآنی ہدایت کا منشا دراصل تعدد ازواج کو ممنوع قرار دینا ہے۔ اس لیے کہ لفظ "عدل" کے ذریعہ جس منصفانہ سلوک کی قید اس نے عائد کی ہے وہ صرف غذا، لباس اور رہائش ہی کے معاملہ میں نہیں ہے بلکہ محبت اور جذباتی تعلق کے معاملہ میں بھی ہے اور اس پہلو سے عدل ناممکن ہے۔[۵۶]

(۲) بعض مخصوص حالات میں عورتوں کو فاقہ کشی اور مفلسی سے بچانے کی خاطر تعدد ازواج مطلقاً ضروری اور ناگزیر ہو جاتا ہے لیکن اگر اس طرح کے حالات نہ ہوں تو اس کی قطعی اجازت نہ دی جانی چاہیے۔[۵۷] اس کے علاوہ وہ تجویز کرتے ہیں کہ ترقی یافتہ طبقات کے لیے تعدد ازواج ایک برے رسم کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ ادارہ خود رسول اکرم کی تعلیمات کے منافی ہے جسے ختم ہو جانا چاہیے جبکہ غیر ترقی یافتہ نسلوں اور طبقوں کے اندر اس رسم کو جاری رکھنے کی اجازت دینی چاہیے جہاں یک زوجگی خراب ثابت ہو رہی ہو۔[۵۸] مصنف کی ان آراء کے تجزیاتی مطالعہ سے ان کے تضادات واضح ہو جاتے ہیں، ایک طرف تو وہ یہ فرماتے ہیں کہ چونکہ محبت وشفقت کے بارے میں قرآنی شرط "عدل" کی پاسداری ممکن نہیں ہے اس لیے قرآنی ہدایت کا اصل منشا اسے ممنوع قرار دینا ہے اور دوسری طرف یہ بھی فرماتے ہیں کہ بعض مخصوص حالات اسے ناگزیر بنا دیتے ہیں اور ان میں اس کی اجازت ہونی چاہیے۔ ان کی یہ رائے بھی باہم متضاد ہے کہ ترقی یافتہ معاشرے کے لیے تو یہ ممنوع اور حرام ہے جبکہ غیر ترقی یافتہ معاشرے کے لیے یہ جائز ہے۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ جذبہ محبت وشفقت میں جو مساویانہ سلوک ناممکن تھا وہ بعض مخصوص حالات میں ممکن بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تعدد ازواج غیر ترقی یافتہ معاشرے کے لیے جائز ہے اور بعض مخصوص حالات میں محبت وشفقت کے معاملے میں بھی مساویانہ سلوک ممکن ہے تو تعدد ازواج کے خاتمہ کی سفارش کس بنیاد پر کی جا رہی ہے؟ اس صورت حال میں تو قرآن کی عائد کردہ پابندیوں کے ساتھ اس کی اجازت عام ہونی چاہیے نہ کہ اس پر پابندی لگائی جائے؟

اسلام نے تعدد ازواج کی اجازت دے کر جنسی انارکی، زنا اور داشتاؤں اور طوائفوں

کے رواج کا قلع قمع کیا ہے۔ اس کے قوانین آفاقی اور ابدی حیثیت رکھتے ہیں، کسی خاص زمانے یا طبقے کے ساتھ مخصوص اور محدود نہیں ہیں جیسا کہ مصنف سمجھتے ہیں۔ اسلامی قوانین آج بھی فرسودہ اور ناقابلِ عمل نہیں ہوئے وہ ہر دور میں قابلِ عمل رہے ہیں اور جب تک اس دھرتی پر انسان زندہ ہے، قابلِ عمل رہیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت اور انسانی معاشرہ کی ضروریات سے بالکل ہم آہنگ ہیں۔ اگر کوئی شخص قرآن کی عائد کردہ تمام شرائط پوری کرسکتا ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ ترقی یافتہ معاشرہ سے تعلق رکھتا ہے یا غیر ترقی یافتہ معاشرے سے، وہ اگر چاہے تو ایک سے زیادہ شادیاں کرسکتا ہے[۵۹] اور یہ بات اس کے لیے باعثِ شرم ہے نہ باعثِ اعتراض۔ البتہ جب جنگ یا آفت میں کثیر تعداد میں مرد مارے جائیں یا کسی ملک میں عورتوں کی شرح پیدائش زیادہ ہو یا موجودہ بیوی شدید قسم کے لاعلاج مرض میں مبتلا ہو تو تعدد ازواج کا عمل صرف جائز ہی نہیں بلکہ قابلِ ترجیح بن جاتا ہے۔ اس طرح کے حالات میں اگر کوئی شخص مزید شادیاں کرنا چاہتا ہے تو موجودہ بیوی کو اظہار ناگواری کے بجائے اپنے شوہر کی خواہش کی تحسین و تائید کرنی چاہیے۔ میری رائے میں صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے معاشرے کو جنسی انارکی اور اخلاقی گراوٹ سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد مصنف نے رسول اکرمؐ کی شادیوں کے مسئلہ پر بحث کی ہے۔ رسولِ اکرمؐ نے جتنی شادیاں کیں ان کی تفصیل بتاتے ہوئے ان کے اسباب و علل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مصنف کے نزدیک ان شادیوں کے اہم مقاصد ان مطلقہ، بے سہارا عورتوں یا بیواؤں کو سہارا دینا تھا جن کے شوہر اسلام کی خاطر شہید کر دئے گئے تھے، باہم برسرِ پیکار قبائل کو متحد کرنا، ان کے درمیان الفت و قربت کے رشتے استوار کرنا، اپنے فدائی ساتھیوں کے درمیان موجود تعلقات کو مضبوط کرنا تھا۔[۶۰] وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ممکن ہے آپ نے بعض شادیاں اولاد نرینہ کی خواہش سے کی ہوں اور اس سے آپ اپنے دشمنوں کے اس توہین آمیز لقب سے محفوظ رہنا چاہتے ہوں، جس سے وہ آپ کو موسوم کرتے تھے۔[۶۱]

مخالفین اسلام نے یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ حضرت محمدؐ نے شادیوں کے معاملے میں ایسی خصوصی مراعات سے فائدہ اٹھایا جن سے استفادہ کا حق آپ کے متبعین کو نہیں تھا۔ اس اعتراض کا جواب مصنف نے ان الفاظ میں دیا ہے: "آپ کی تمام شادیاں اس آیت کے نزول سے پہلے ہوچکی تھیں جس میں بیویوں کی تعداد کو چار تک محدود رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے اور

اس آیت کے نزول کے ساتھ ہی آپ سے تمام مراعات واپس لے لی گئیں۔ اور آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنی کسی بھی بیوی کو علیحدہ نہیں کر سکتے۔[۶۳]

اس معاملہ میں بھی مصنف کا دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ کے تفصیلی مطالعہ سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تعدد ازدواج پر تحدید والی آیت کے نزول کے بعد بھی آپ نے متعدد شادیاں کی ہیں، انھوں نے سنہ ۵ھ میں حضرت زینبؓ سے نکاح کیا جو آپ کی پانچویں بیوی تھیں اسی سال آپ نے حضرت جویریہؓ سے بھی شادی کی، حضرت صفیہؓ سے سنہ ۶ھ میں اور حضرت ام حبیبہؓ اور حضرت میمونہؓ سے سنہ ۷ھ میں آپ نے نکاح کیا۔ تعدد ازدواج پر تحدید کے باوجود آپؐ کی ان شادیوں کی اصل وجہ وہی ہے جو مولانا مودودیؒ نے قرآن کے حواشی میں لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عام ضابطہ سے آپ کو مستثنیٰ قرار دیا تھا اور آپ کے لیے خدا ہی کی طرف سے یہ مخصوص رعایت تھی کہ آپ چار سے زیادہ شادیاں کر سکتے ہیں۔ مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے کہ آپ کے معاملہ میں عام ضابطے سے استثنا کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ آپ کو اپنی بیوی کو طلاق دینے کی اجازت نہ تھی جبکہ عام مسلمانوں کو یہ اجازت حاصل تھی۔ آپؐ کی ازواج مومنین کی مائیں قرار دی گئی ہیں۔ انھیں اس بات کی اجازت تھی کہ کوئی عورت خود کو بغیر مہر کے آپ کے حبالۂ عقد میں دینے کے لیے تیار ہو تو آپ بغیر مہر ادا کیے اس سے شادی کر سکتے ہیں جبکہ آپؐ کے پیروؤں کو اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ آپؐ پر نماز تہجد فرض تھی مگر آپ کے پیروؤں کے لیے نفل تھی۔ آپؐ پر اور آپؐ کے اہل و عیال پر صدقات کی رقوم حرام قرار دی گئیں جبکہ آپ کے غریب پیروکاروں کے لیے وہ حلال ہیں۔[۶۴]

طلاق کے بارے میں عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ابتدا کی ہے یا کم از کم بغیر کسی حد بندی کے اس کی اجازت دی ہے۔ لیکن تاریخی اعتبار سے یہ بات بالکل بے بنیاد اور غلط ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے، جیسا کہ لائق مصنف نے عہد نامہ عتیق اور ڈولنگر کی کتاب The Gentile & the Jews کے حوالے سے لکھا ہے، کہ طلاق کی رسم یہودیوں، یونانیوں، اہل روم اور شہری عربوں وغیرہ کے یہاں بھی رائج تھی۔ ان اقوام میں طلاق کا حق صرف مردوں کو حاصل تھا عورتیں اس سے محروم تھیں۔ اس طرح کے حالات میں حضرت محمدؐ نے اس رسم کی مذمت فرمائی۔ آپ نے صاف اور صریح لفظوں میں فرمایا کہ اللہ کے نزدیک طلاق سے زیادہ ناپسندیدہ کوئی عمل نہیں ہے۔ تمام جائز امور میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند عمل طلاق ہے۔[۶۵] آپ نے اپنے پیروکاروں کو نکاح

کی اہمیت اور اس کے اغراض و مقاصد بھی بتائے اور اس ضمن میں قرآن مجید کے مقتضیات بھی واضح فرمائے۔ طلاق کے امکانات کو کم سے کم کرنے کے لیے آپؐ نے متعدد بندشیں عائد فرمائیں۔ مثال کے طور پر آپ نے شادی سے قبل مرد و عورت کو ایک دوسرے کو دیکھ لینے کی اجازت دی، اس طرح کسی فریق کی طرف سے علٰحدگی کے امکانات کو کم فرمایا۔ انھوں نے مسلمانوں کو اللہ کا وہ حکم بھی بتایا جس میں اپنی بیویوں کے ساتھ مہربانی اور احترام کا رویہ اختیار کرنے کی ہدایت ہے گرچہ وہ بیویاں انھیں ناپسند ہوں۔ اپنے اختلافات کا تصفیہ باہمی افہام و تفہیم سے کر لیا جائے یا کسی مصالحت کرانے والے کے ذریعہ ان کو سلجھایا جائے یا پھر اس معاملہ کو قاضی کی عدالت میں لے جایا جائے۔ اگر عورت نافرمانی کرے یا شوہر کی عدم موجودگی میں غیر مرد کو گھر میں آنے کی اجازت دے یا کسی کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھے تو اس کو تنبیہ کی جائے اور بالکل آخری مرحلہ میں اسے مارا جائے۔ لیکن اگر کوئی شوہر اپنی بیوی سے محبت و احترام کا سلوک نہ کر سکے چاہے اس کی وجہ بیوی کی بدصورتی ہو، اس کی نافرمانی ہو گستاخی ہو یا بد اخلاقی اور غیر عفت مآبی ہو یا کوئی بانجھ عورت شوہر کی دوسری شادی کے لیے تیار نہ ہو یا فریقین کے باہمی تنازعہ کے حل کی کوئی امید نہ ہو تو اس صورت میں شوہر بغیر قاضی کی مرضی کے اپنا حق طلاق استعمال کر سکتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ طلاق کے ذریعہ جدائی کے بعد دوبارہ طلاق یافتہ عورت سے شادی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ عورت کسی اور شخص سے شادی کرے اور ان کے باہمی تعلقات قائم ہو جائیں (اس شادی میں طلاق دینے کی کوئی پیشگی شرط نہ رکھی گئی ہو) اور پھر اسے (بغیر کسی دباؤ کے) طلاق ہو جائے۔ لیکن اگر عورت نے اس شرط پر شادی کی کہ شوہر شادی کے بعد اسے طلاق دے دے تاکہ وہ پہلے شوہر سے شادی کے قابل ہو سکے تو یہ دونوں زنا کے مرتکب قرار پائیں گے اور سزائے رجم کے مستحق ہوں گے۔ [illegible] طلاق یافتہ عورت سے شادی کے لیے یہ شرط جو عائد کی گئی ہے وہ شوہر پر زوجیت [illegible] اہمیت واضح کرنے کے لیے ہے تاکہ وہ اقدام طلاق کے فیصلہ سے قبل سو بار اس پر [illegible] غور کر لے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اگر محض دنیاوی خوشی کے حصول کے لیے طلاق [illegible] کی نوبت آتی ہے اور اسی غرض کے لیے متعدد شادیاں کی جاتی ہیں تو یہ فعل خدا کی نگاہ میں سخت ناپسندیدہ اور اس کے غضب کو دعوت دینے والا ہے۔

مصنف نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اسلام نے مرد کی طرح عورتوں کو بھی جدائی کے حصول کا اختیار بخشا ہے۔ ایک عورت شوہر کی طرف سے مناسب نفقہ کے نہ ملنے، نامناسب برتاؤ، لاعلاج مرض، اس کے پاگل پن، اس کی بالکل بے توجہی، اس کی بدصورتی کی وجہ سے اس سے بیزاری کی بنیاد پر خلع کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ اور وہ اس بنیاد پر بھی جدائی کا مطالبہ کر سکتی ہے کہ اس کے والدین نے اس کی مرضی کے بغیر اس کی شادی کر دی۔[۲۵] مصنف نے اسلام میں باندیوں کی اجازت، تبادلہ یا معاوضہ کے ذریعہ بھی ان کی ناممکنہ واپسی پر اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ باندیاں رکھنے کی یہ رسم اسلام کی حقیقی تعلیمات کے منافی ہے اس کی اجازت عارضی طور پر اسلام کے ابتدائی دور میں بعض ناگزیر صورت حال میں دی گئی تھی۔ اس معاملہ میں ان کی یہ رائے ناقابل قبول ہے اور اس بات کی مظہر ہے کہ رسول اکرم نے جن اسباب کی بنا پر اس رسم کو جائز قرار دیا تھا ان سے مصنف باخبر نہیں ہیں۔ اسلامی شریعت میں باندیوں کی جو اجازت ہے وہ صرف اس صورت میں ہے کہ عورتیں جنگ کے دوران گرفتار ہوئی ہوں اور ان کے رشتہ دار معاوضہ یا تبادلہ کے ذریعہ ان کی واپسی کے خواہش مند نہ ہوں۔ اس کی اجازت طوائفوں اور داشتاؤں کے اس رسم کے خاتمہ کی غرض سے دی گئی تھی جس کی بنا پر انسانوں کے اخلاق و کردار کو گھن لگ چکا تھا اور اسی اجازت کی بنا پر ابتدائی مسلم سماج میں اس طرح کے کسی ادارہ کا کوئی وجود نہیں ملتا۔

باندیوں کی اجازت جن شرائط سے مشروط تھی اور آج بھی ہے، وہ درج ذیل ہیں:-

(۱) جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتیں اس وقت تک اسلامی حکومت کی ملک میں رہیں گی جب تک تبادلہ یا معاوضہ کے ذریعہ یا اس کے بغیر ان کی رہائی کا فیصلہ نہیں ہو جاتا ورنہ وہ مجاہدین اور دیگر افراد کے درمیان تقسیم کر دی جائیں گی۔ اس دوران کسی کو ان عورتوں سے جنسی تعلق قائم کرنے کی اجازت نہیں ہوگی اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اسے سخت قسم کی سزا دی جائے گی جو سزائے رجم بھی ہو سکتی ہے۔

(۲) اگر حکومت انھیں باندی بنانے کا فیصلہ کرتی ہے تو وہ مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں گی۔

(۳) افراد کی ملک بن جانے کے بعد حکومت کو ان کی واپسی کا اختیار نہ ہوگا الا یہ کہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہ ان عورتوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کر رہے ہیں۔

(۴) باندیوں کو اس بات کی اجازت ہوگی کہ وہ آپس میں طے شدہ معاوضہ کی رقم دے کر خود کو اپنے مالک سے آزاد کرالیں اور پھر وہ جس کے ساتھ چاہیں شادی کر سکتی ہیں۔

(۵) اگر کوئی باندی اپنے مالک سے اپنی آزادی کا سودا کرنا چاہے تو مالک کو اس کی اجازت دینی ہوگی اور اگر وہ معاوضہ کی رقم دینے کی پوزیشن میں نہ ہو تو بیت المال سے اس کا معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

(۶) باندیوں کی تقسیم کے بعد ان کے مالکان کو ان سے جنسی تعلق قائم کرنے کا حق حاصل ہو جائے گا اس معاملہ میں ذات، عقیدہ اور مذہب کی تفریق حائل نہ ہوگی۔

(۷) مالکوں کے علاوہ اور کسی کو ان سے جنسی تعلق کی اجازت نہیں ہے۔ اور اگر مالک اس کی شادی کسی اور سے کر دیتا ہے تو اس کے شوہر کو بھی اس کی اجازت نہ ہوگی کہ وہ کسی اور کو جنسی تعلق کی اجازت دیں۔

(۸) مالکوں کو جنسی تعلق کی اجازت اسی وقت ہوگی جب وہ عورتیں حیض کی ایک عدت گزار لیں تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہ حمل سے نہیں ہیں لیکن اگر وہ حاملہ ہوں تو وضع حمل کے بعد ہی ان سے یہ تعلق قائم ہو سکتا ہے۔ اس سے قبل ان سے جنسی تعلق جائز نہیں ہے۔

(۹) ان باندیوں سے پیدا ہونے والے بچے مالک کی جائز اور قانونی اولاد متصور ہوں گے اور اس کے دوسرے بچوں کی طرح اس کی وراثت کے حق دار ہوں گے۔

(۱۰) اپنے مالکوں کے انتقال کے بعد وہ باندیاں آزاد متصور ہوں گی[۴۵]

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جس طرح جنگوں کی کوئی حد متعین نہیں کی جا سکتی اسی طرح ایک شخص کے تصرف میں آنے والی باندیوں کی حد بندی بھی ناممکن ہے۔ اگر اس رواج کو قائم رہنے دیا جاتا تو دنیا میں طوائفوں کے پیشے کا کہیں وجود بھی نہ ہوتا۔

مخالفین اسلام بالخصوص عیسائیوں نے غلطی سے یہ باور کر لیا ہے کہ اسلام نے داشتاؤں کے رواج کو قانونی حیثیت دے دی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس رواج کو اسلام نے کبھی تسلیم ہی نہیں کیا گرچہ عربوں، یہودیوں، عیسائیوں اور تمام ملحقہ ملکوں میں یہ رواج عام تھا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ پیغمبر اسلام نے ابتدا میں گرچہ اس کی مخالفت نہیں کی لیکن اپنی حیات کے آخری حصہ میں جب درج ذیل آیت نازل ہوئی، واضح لفظوں میں اس رواج کی ممانعت فرما دی:۔

"تمہارے لیے مسلمانوں میں سے پارسا عورتیں اور اہل کتاب کی پارسا عورتیں حلال ہیں بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے نکاح کے ذریعہ ان کے محافظ بنو نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرو" (المائدہ ۵)

دورِ جدید کے مسلم مفکرین اور مورخین کے نزدیک جو مسائل مختلف فیہ ہیں ان میں ایک پردہ کا رواج بھی ہے۔ جو لوگ قدیم خیالات کے حامی ہیں وہ پردے کی حمایت اور وکالت کرتے ہیں جبکہ مغربی ثقافت و افکار سے متاثر حضرات اس سے اختلاف کرتے ہیں اور انسانی ترقی کی راہ میں اسے ایک رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔ فاضل مصنف کا تعلق بھی اسی دوسرے طبقہ سے ہے۔ ان کے نزدیک پردہ کا رواج رسول اکرمؐ کی اصلاحات کے منافی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ قرآن سے ایسا کوئی حکم ثابت نہیں ہے۔ اور کوئی قانونی شق ایسی نہیں بتائی جاسکتی جس کی رو سے اس رواج کے جاری رہنے پر اصرار کیا جائے۔ چنانچہ اس کی تائید میں وہ متعدد مثالیں پیش کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے جنگِ جمل میں فوج کی قیادت کی، حضرت فاطمہؓ نے خلافت کے مسئلہ پر ہونے والے متعدد مباحثوں میں شرکت فرمائی، حضرت زینب نے معرکہ کربلا کے بعد اپنے نوجوان بھتیجے کی حفاظت فرمائی۔ لیکن ان مثالوں کو پیش کرتے ہوئے وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ تمام واقعات غیر معمولی حالات میں پیش آئے۔ جہاں تک حضرت عائشہؓ کے عمل کا سوال ہے تو انھیں خود اپنے اس عمل پر بہت صدمہ ہوا تھا۔ وہ اس حقیقت کو بھی ملحوظ نہیں رکھ پائے کہ قرآن نے عورتوں کو پردہ کرنے اور مردوں سے اختلاط نہ کرنے کے احکام دیے ہیں اور انھیں اس بات کی تاکید کی ہے کہ وہ ناگزیر حالات کے ماسوا بلا ضرورت اپنے گھروں سے باہر نہ نکلیں۔

مصنف نے اپنے اختتامی جملوں میں یہ بات لکھی ہے کہ رسول اکرمؐ کی نافذ کردہ اصلاحات کے ذریعہ عورتوں کی حالت میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔

دوسرے حصہ کا چھٹا باب غلامی کے موضوع پر ہے۔ اس رسم کا چلن ہر زمانہ اور ہر قوم میں رہا ہے۔ یہودیوں، یونانیوں، رومیوں، قدیم جرمنوں اور دیگر قدیم اقوام میں اس رسم کا رواج تھا۔ یہ غلام اپنے وطن کے ہوں یا غیر قوم کے، جنگ میں گرفتار ہو کر آئے ہوں یا خرید کر محض ایک اثاثہ کی حیثیت رکھتے تھے اور مکمل طور پر اپنے مالکوں کے رحم و کرم پر ہوتے تھے۔ معمولی معمولی غلطیوں پر انھیں سخت جسمانی و ذہنی اذیتیں دی جاتی تھیں۔

عیسائیت نے اس بری رسم کے خاتمہ کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ کلیسا نے جو خود اپنے لیے بھی غلام رکھتا تھا اور واضح لفظوں میں اس قابلِ بندش ادارے کو جواز کی سند بخش دی تھی، غلام اور لونڈی کو آقا کی مکمل اطاعت کی تلقین کی، غلاموں کو آپس میں شادیاں کرنے

کی اجازت نہ تھی، آزاد اور غلام کے درمیان شادی بھی ممنوع تھی جس کی متعدد سزائیں متعین تھیں، ان سزاؤں میں سے ایک یہ تھی کہ اگر کوئی آزاد عورت کسی غلام سے شادی کرلیتی تو عورت قتل کی جاتی اور غلام کو زندہ جلا دیا جاتا۔[58]

رسول اکرمؐ جب تشریف لائے تو یہ رسم نہ صرف آپ کی قوم میں بلکہ ہمسایہ اقوام میں بھی جاری تھی۔ آپ کے زمانہ میں دو قسم کے غلام ہوتے تھے۔ ایک جنگ میں گرفتار ہونے والے دوسرے خریدے گئے افراد۔ آپ نے واضح لفظوں میں غلاموں کی خرید و فروخت پر پابندی لگائی اور ایسے کاروبار کرنے والے کو دائرہ انسانیت سے خارج قرار دیا۔[58] ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ آج بھی بعض مسلم ممالک میں خرید کر غلام بنائے جانے کی رسم جاری ہے جہاں غریب مردوں اور خاص طور پر محتاج عورتوں کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کے بالکل منافی حرکت ہے۔ اسلام نے اسے ایک زبردست جرم قرار دیا ہے۔ جہاں تک جنگ میں پکڑے جانے والے افراد کو غلام بنائے جانے کا سوال ہے تو رسول اکرمؐ نے چند پابندیوں کے ساتھ اس کی اجازت اس لیے دے رکھی تھی کہ اس وقت تک آپؐ کے لیے دشمنوں سے ہونے والی جنگ کا سلسلہ بند کردینا عملاً ناممکن تھا، نیز اس زمانہ میں قیدیوں کی رہائی یا تبادلہ کا کوئی ضابطہ موجود نہ تھا وہ قیدی یا تو قتل کر دیے جاتے تھے یا غلام بنائے جاتے تھے۔ ان حالات میں یک طرفہ طور پر اس رسم کے خاتمہ کا نتیجہ اس صورت میں سامنے آتا کہ دشمنانِ اسلام کو معاشی، سیاسی، اخلاقی اور ذہنی غرض ہر قسم کے دباؤ سے آزادی مل جاتی اور مسلم قیدی مکمل طور پر دشمنوں کے رحم و کرم پر ہوتے چاہے وہ اسے قتل کردیں، ارتداد پر مجبور کریں، بھوکوں مار ڈالیں غلامی اور غیر انسانی سطح پر اتر کر ان سے مزدوری کرائیں اور ان کی بے عزتی کریں۔ ان تمام نتائج کو مدنظر رکھتے ہوئے درج ذیل شرائط و قیود کے ساتھ انھوں نے اس رسم کی اجازت دی تھی:۔

(۱) جنگ میں حاصل ہونے والے غلاموں کو قتل کرنے، زندہ جلانے، فاقہ سے مارنے دین کی تبدیلی پر مجبور کرنے یا جسمانی اذیت دینے کی اجازت نہیں ہے۔

(۲) ان کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا جائے اور ان کی عورتوں کی بے عزتی نہ کی جائے۔

(۳) انھیں کھانے اور پہننے کے لیے وہی غذا اور لباس دئے جائیں جو ان کے مالک کھاتے اور پہنتے ہیں۔

(۴) انھیں "غلام و باندی" جیسے القاب سے پکارنے کی بجائے "جوانمرد" اور "جوان عورت"

[59]

جیسے القاب سے پکارا جائے۔

(۵) مالک انھیں اپنے خاندان کا فرد سمجھے اور مسلمانوں کے بھائیوں جیسا ان سے سلوک کرے۔

(۶) ان سے مناسب انداز میں منصفانہ طور پر ہی کام لیا جائے۔

(۷) انھیں اختیار دیا گیا کہ وہ خدمت کی اجرت کے بارے میں مالک سے اپنی آزادی کا معاہدہ کر سکتے ہیں۔

(۸) وہ غلام جو آزادی کے لیے اپنے مالک سے معاہدہ کرنا چاہے اور اس کے پاس فدیہ کی ادائیگی کے لیے کافی رقم نہ ہو تو اسے بیت المال سے قرض دیا جائے گا۔[۳۵]

رسول اکرمؐ سے قبل قیدیوں کی رہائی یا تبادلہ کا کوئی دستور نہ تھا یہ شرف پیغمبر اسلام ہی کو حاصل ہے کہ آپ نے جنگی قیدیوں کی آزادی کے لیے یہ دونوں طریقے رائج فرمائے۔ انھوں نے دو مختلف مواقع پر مسلم قیدیوں کے بدلے میں غیر مسلم گرفتار شدگان کو رہا کیا ہے[۳۶] نیز متعدد مواقع پر بغیر کسی معاوضہ کے بھی آپ نے قیدیوں کو رہا فرمایا ہے۔ مثال کے طور پر صلح حدیبیہ کے دوران اسی قیدی اور غزوۂ حنین کے بعد بنو ہوازن کے چھ ہزار قیدیوں کو بلا کسی معاوضہ کے رہا کیا گیا تھا۔[۳۷] مزید برآں آپ نے غلاموں کی آزادی کی دو صورتیں رائج فرمائیں۔ پہلی صورت عتق کی ہے جس میں ان کو بغیر معاوضہ لیے آزاد کر دیا جاتا ہے اور دوسری صورت مکاتبت کی ہے جس میں غلام ایک تحریری معاہدہ کے ذریعہ اپنی خدمت کے بدلے آزادی کا معاملہ کر سکتا ہے۔[۳۸] غلاموں کی بلا معاوضہ رہائی کی ترغیب دلانے کی خاطر آپ نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک اس عمل سے زیادہ محبوب کوئی عمل نہیں ہے۔ آپ نے مختلف گناہوں کے کفارے کے لیے غلاموں کی رہائی کو بھی کفارہ کی ایک شکل تجویز فرمائی۔ اسی طرح غیر شعوری طور پر کسی مومن کے قتل کا کفارہ بھی ایک غلام کی رہائی قرار دی گئی۔ اس کے علاوہ آپ نے مالکوں کو اس بات کا پابند بنایا کہ اگر اس کا کوئی غلام فدیہ کے بدلے میں اپنی آزادی چاہتا ہے تو وہ اس کی خواہش تسلیم کرلے اور فدیہ کی رقم آپس میں طے کر لی جائے۔ آپ نے زکوٰۃ کی رقم کا ایک حصہ ایسے غلاموں کی آزادی کے لیے مختص فرمایا جن کے پاس فدیہ کی ادائیگی کی کوئی صورت نہ ہو۔

رہا یہ سوال کہ کیا آج بھی جنگ میں گرفتار افراد کو غلام بنایا جا سکتا ہے؟ تو مصنف کا یہ خیال ہے کہ آج کے حالات میں غلامی کی یہ قسم بھی ممنوع ہونی چاہیے اس لیے کہ غلام بنانے

کے جو شرائط ہیں وہ آج نہیں پائے جاتے۔ مثلاً یہ کہ صرف اپنے دفاع کی خاطر کفار و مشرکین سے ہونے والے جہاد میں گرفتار لوگوں کو غلام بنایا جا سکتا ہے نیز یہ کہ جس طرح کی حالت جنگ میں صدر اول کے مسلمان مبتلا تھے وہ حالت آج موجود نہیں ہے۔ مصنف کی یہ رائے اس لیے صحیح نہیں ہے کہ قرآن کی کسی آیت یا رسول اکرم کی کسی حدیث سے غلامی کی ممانعت ثابت نہیں ہے۔ اس کے برخلاف آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا "جہاں تک تمہارے غلاموں کا تعلق ہے، انھیں وہی کھانا کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور ویسے ہی کپڑے پہناؤ جیسے تم خود پہنتے ہو۔ اگر ان سے کوئی ایسی غلطی ہو جائے جسے تم معاف نہ کر سکو تو انھیں فروخت کر دو، انھیں اذیت مت پہنچاؤ اس لیے کہ وہ بھی (تمہاری طرح) اللہ کے بندے ہیں"[۵۶] حتیٰ کہ مرض الموت میں بھی آپ نے غلاموں کی فکر کرتے ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور ان کے بارے میں خدا سے ڈرنے کی وصیت فرمائی تھی[۵۷]

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے غلامی کا خاتمہ نہیں فرمایا تھا اس لیے کہ اگر آپ ایسا کرنا چاہتے تو سود اور خونریزی کی طرح واضح لفظوں میں اس کی بھی ممانعت فرما دیتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے غلامی کے یک طرفہ طور پر خاتمہ کے نتائج کے مدنظر اس کی اجازت برقرار رکھی البتہ اس رسم کی تکلیف دہ شکلوں کا خاتمہ فرما دیا۔ چنانچہ یہ تصور کر کے کہ ابتدائی دور کے مسلمان جس حالت جنگ میں مبتلا تھے اس کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ غلامی کے انسداد کی تجویز پیش کرنا دانش مندی کی بات نہیں ہے۔ کیا آج کے مسلمان کو کسی ملک یا طبقہ کے دشمنوں کی طرف سے جارحیت کا خطرہ نہیں ہے؟ کیا دشمنان اسلام نے مسلمانوں سے عدم جارحیت کا کوئی تحریری معاہدہ کر لیا ہے اور ہمیشہ کے لیے جنگ یا جارحانہ اقدامات کے امکانات ختم ہو گئے ہیں؟ یقیناً ایسی صورت حال نہیں ہے۔ پھر اگر مصنف کی تجویز کو قبول کرتے ہوئے اس رسم کے ناجائز و حرام ہونے کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور مسلمانوں پر کسی جارحیت کے نتیجے میں مسلمان فوجی قیدی بن جائیں اور انھیں بدترین قسم کی جسمانی اذیتوں سے گزارا جائے تو کیا تمام مسلمان اپنے ان ہم مذہب افراد کے سلسلے میں خاموش تماشائی بنے رہیں گے؟ یا اس صورت حال کے خاتمہ کی کیا متبادل تجویز ہوگی؟ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ اس کا انحصار دشمنان اسلام کے رویہ پر ہوگا۔ اگر وہ قیدیوں کے تبادلہ پر راضی ہوں گے تو اسلامی حکومت ان کے اس فیصلہ کا تہ دل سے خیر مقدم کرے گی ورنہ وہ خود ہی اس سمت میں

پیش قدمی کرے گی۔ لیکن اگر وہ اس کے لیے راضی نہ ہوں اور قیدیوں کو غلام بنانے کا فیصلہ کریں تو مسلمان بھی اپنے دشمنوں کے قیدیوں کو ذکر کردہ شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے غلام بنالیں گے۔ تاہم انتقاماً قیدیوں کو جلانے یا عورتوں کی بے عزتی کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

ساتویں باب میں اسلام کے سیاسی نظام اور انتظامی معاملات سے بحث کی گئی ہے نیز یہ دکھایا گیا ہے کہ رسول اکرم، ان کے خلفاء اور دیگر مسلم حکمرانوں نے اپنی غیر مسلم رعایا (ذمیوں) کو کیا حقوق بخشے تھے۔ رسول اکرمؐ نے ذمیوں کو جو مراعات وحقوق عطا فرمائے تھے ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

(۱) غیر مسلم رعایا کو غلام نہیں بنایا جا سکتا اور نہ ہی ان سے سختی کا سلوک روا رکھا جائے گا۔

(۲) انھیں مذہب پر عمل کی آزادی، فکر کی آزادی اور مکمل مساوات حاصل ہوگی۔

(۳) ان کی عبادت گاہیں، گرجا، مندر، شوالے وغیرہ محفوظ رہیں گے اسی طرح ان کی آبادیوں میں مزید عبادت گاہوں کی تعمیر کی اجازت بھی ہوگی۔

(۴) ان کو عقیدہ کی تبدیلی کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا اس لیے کہ دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ (البقرہ ۲۵۶) جب کچھ انصار مدینہ نے یہودی لڑکوں کو اسلام قبول کرنے کے لیے مجبور کرنا چاہا تھا تو رسول اکرم نے انھیں اس آیت کا حوالہ دے کر اس کام سے روک دیا تھا۔ خود حضرت عمرؓ نے اپنے ایک عیسائی غلام کو متعدد بار قبول اسلام کی تلقین کی مگر وہ انکار ہی کرتا رہا اس پر بھی حضرت عمر نے یہی آیت پڑھی تھی کہ دین میں کوئی جبر نہیں ہے[۱۹]

(۵) انھیں اپنے معاملات کا تصفیہ اپنے پرسنل لاء کے مطابق کرنے کا اختیار ہوگا اسلامی مملکت اس میں مداخلت نہیں کرے گی۔

(۶) انھیں فوجی خدمات سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا ان کے جان ومال اور مذہب کی حفاظت کی جائے گی کسی مسلمان کو ان کی جائداد پر قبضہ کرنے، انھیں خریدنے کی اجازت نہ ہوگی حتی کہ مسلمانوں کا امام اور حکمران بھی انھیں اپنی جائداد سے محروم نہیں کر سکتا۔

(۷) فوجی خدمت سے استثناء اور جان ومال ومذہب کی حفاظت کے عوض ان سے جزیہ لیا جائے گا۔ یہ ٹیکس صرف ان کے جسمانی لحاظ سے تندرست افراد سے وصول کیا جائے گا۔ بوڑھے، عورتیں، بچے، معذور، مجنون، محتاج، راہب، سادھو، پجاری وغیرہ اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ وہ معاشی تنگی کی حالت میں بیت المال سے تعاون کے بھی مستحق ہوں گے۔ ان سے

جزیہ کی وصولی اسلام قبول نہ کرنے کی سزا نہیں ہے بلکہ ان کی محافظت کی ذمہ داری کا ایک معاوضہ ہے[۹۳] یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اس قسم کا ٹیکس مصر کے ان مسلمان کسانوں سے بھی لیا گیا ہے جنھیں فوجی خدمات سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا[۹۴]۔

(۸) کسی متوفی کے ذمہ اگر جزیہ کی کچھ رقم باقی ہو تو اس کے مالِ وراثت سے وہ رقم وضع کی جائے گی نہ ان کے وارثوں سے اس کا مطالبہ کیا جائے گا۔

(۹) اگر کوئی غیر مسلم مسلمان فوج میں ملازمت کرے گا تو اسے اس ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا اور وہ مالِ غنیمت میں سے اپنے حصہ کا حق دار ہوگا[۹۵]۔

(۱۰) اگر مسلمان اپنی غیر مسلم رعایا کی زندگی کی حفاظت سے قاصر ہوں تو انھیں جزیہ کے نام پر وصول کردہ تمام رقوم واپس کردی جائیں گی[۹۵]۔

(۱۱) ذمیوں کا خون مسلمانوں کی طرح حرام ہوگا اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کردے تو وہ مسلمان بھی اسی سزا کا مستحق ہوگا، حضرت عمر کی خلافت میں بکر بن وائل نے حیرت نامی ایک عیسائی کو قتل کر ڈالا، حضرت عمرؓ نے فیصلہ فرمایا کہ قاتل مقتول کے وارثوں کے حوالے کر دیا جائے چنانچہ مقتول کے وارثوں نے انھیں بھی بدلے میں قتل کر دیا[۹۶]۔

آٹھواں باب اسلام میں مذہبی و سیاسی گروہ بندیوں سے متعلق ہے۔ ابتدا میں مصنف نے خلافت کے لیے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے انتخابات سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے جنگ جمل، جنگ صفین، حضرت عمرو بن العاص اور ابو موسیٰ اشعری کی ثالثی، حضرت علی کی شہادت، حادثہ کربلا وغیرہ کی تفصیل پیش کی ہے اس کے علاوہ انھوں نے شیعوں کے اہم فرقے زیدی، اسماعیلی، اثنا عشری وغیرہ اور سنیوں کے اہم فرقے حنفی شافعی، مالکی اور حنبلی وغیرہ کا ذکر کیا ہے ان کے علاوہ خوارج اور فرقہ وہابیہ کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

نویں باب میں مسلمانوں کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تفصیلی بیان ہے جس میں مصنف نے امام جعفر صادق، خلیفہ مامون، المعز لدین اللہ کی خدمات کا بطور خاص تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے علم فلکیات و ریاضیات، کیمیا، نباتیات، ارضیات، طب، فن تعمیر، تاریخ، شاعری نیز علم و دانش کے دیگر میدانوں میں مسلمانوں کے کارناموں کا ذکر بھی کیا ہے ساتھ ہی تاتاریوں کے ہاتھوں خوفناک تباہ کاریوں کا بھی ذکر ہے۔

دسویں باب میں اسلام کی عقلی و فلسفیانہ روح پر تفصیلی بحث ملتی ہے، مصنف نے مسلمانوں میں عقلیت و فلسفہ کے فروغ کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ابوالحسن الاشعری، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کی تعلیمات کا بھی ذکر کیا ہے۔

آخری باب مشائیت اور تصوف پر ہے۔ اس میں مصنف نے متقدمین و متاخرین صوفیاء کے افکار و خیالات کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

لائق مصنف نے اپنی اس عظیم تصنیف میں بڑی وسعت سے عربی کی معیاری کتب سے حوالے دیے ہیں۔ مثلاً ابن ہشام کی سیرت الرسول، ابن اثیر کی تاریخ کامل ....

سیرت حلبیہ، صحیح بخاری، مشکوٰۃ، امام سیوطی کی تاریخ الخلفاء، امام ابویوسف کی کتاب الخراج وغیرہ۔ اسی طرح انھوں نے انگریزی کی معیاری کتب سے بھی استفادہ کیا ہے مثلاً لینارمنٹ کی Anciant History of the East ڈوالنگر کی The Gentle &
the Jew، گبن کی Decline & Fall of Roman Empire اور ملز کی History of
the church of the Christ وغیرہ۔ ان کے علاوہ عہدنامہ عتیق و جدید وغیرہ بھی پیش نظر رہی ہیں

اس کتاب میں ایک نقص یہ ہے کہ اس میں متعدد عربی الفاظ کے ہجے غلط لکھے گئے ہیں، مثلاً اسقونی کو Asquni (P.IXVII) طَبَری کو Tibri (P.19) رَجَز کو Rojz (P.69) عمرو بن العاص کو Amrū b. Āsi امیہ کو Ommeya (P.95) وَفد کو Wafad (P.125) وہابیز کو Wahabis (P.125) غُرَرُ وَالدُّرَرْ کو Ghurrar Wad Durran (P.166) جامع الترمذی کو Jammaut Tirmizi (P.170) علماء (جو خود جمع ہے) کو Ulamas (P.186) لکھا گیا ہے۔

یورپین سوانح نگار و مورخین کی تصانیف کے مقابلے میں یہ اہم تصنیف بآسانی پیش کی جا سکتی ہے۔ اخبار Pioneer کے تبصرہ نگار کے یہ الفاظ بالکل مبنی برحقیقت ہیں: "میں بغیر کسی شک و شبہ کے یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہماری زبان میں مسلمانوں نے رسول اکرمؐ کی سوانح اور ان کی تعلیمات پر اب تک جتنی کتابیں تصنیف کی ہیں اس کتاب کی ترجمانی ان سب کتابوں سے بہتر ہے۔"

مآخذ و حواشی

۱؎ واسطی، سید راضی۔ میموآئرس اینڈ ادر رائٹنگس آف سید امیر علی۔ دہلی ۱۹۸۵ء صفحہ ۶۶

۲؎ دی اسپرٹ آف اسلام ۔ لندن سنہ ۱۹۶۲ء مقدمہ صفحات VII, VIII

۳؎ ایضاً ، مقدمہ صفحات XVII, XVIII ۴؎ ایضاً صفحہ XVIII

۵؎ ایضاً ۶؎ ایضاً ۷؎ ایضاً صفحہ IXIII

۸؎ اصحاب کہف ، دہلی سنہ ۱۹۸۶ء صفحات ۳۳، ۳۴

۹؎ تفہیم القرآن ج ۳ دہلی سنہ ۱۹۶۳ء صفحات ۴۳، ۴۴

۱۰؎ اصحاب کہف ص ۱۰۱-۱۰۳ ۱۱؎ ایضاً ص ۵۱-۶۶ ، ص ۱۰۲-۳۰

۱۲؎ قرآن مجید (بنی اسرائیل آیت ۱) مولانا مودودی، تفہیم القرآن ج دوم دہلی سنہ ۱۹۶۹ء ص ۵۸۹

ندوی، سید سلیمان سیرت النبی ج سوم اعظم گڑھ سنہ ۱۹۶۵ء صفحات ۲۷-۳۳

صحیح بخاری باب بنیان الکعبہ کتاب التفسیر (حواشی) ج اول وثانی دہلی صفحات ۵۴۸ ، ۶۸۴

۱۳؎ دی اسپرٹ آف اسلام ص ۵۹

۱۴؎ امیر علی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ آپؐ نے یہودیوں سے جو معاہدہ فرمایا تھا اس معاہدہ کے شرائط کی یہودیوں کی طرف سے خلاف ورزی ان قبائل یہود کی جلاوطنی کا سبب بنی ۔ اسپرٹ آف اسلام ص ۷۲-۷۹-۸۰

۱۵؎ ایضاً صفحات ۷۹، ۸۰، ۸۲

۱۶؎ امیر علی نے تورات کی ان آیات کو نقل نہیں کیا ہے اس کا امکان ہے کہ موصوف کی رسائی وہاں تک نہ ہو سکی ہو۔

۱۷؎ سیرت النبی ج اول اعظم گڑھ سنہ ۱۹۶۱ء صفحات ۳۵۴ — ۳۹

۱۸؎ دی اسپرٹ آف اسلام صفحہ ۸۲

۱۹؎ ابتدا میں آنحضرتؐ نے یہودی اور عیسائی عورتوں سے نکاح کی اجازت اس امکان کی بنا پر دیدی تھی کہ شاید وہ اپنے مشرکانہ عقائد سے باز آجائیں لیکن بعد میں آپ نے اس سے منع فرما دیا تھا اس کی وجہ ان کے وہ مشرکانہ عقائد تھے کہ حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں ۔ اور یہ بداہتہً اسلامی عقیدے کے خلاف ہیں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں نے مسلمانوں کو کتابیہ عورتوں سے شادی سے منع فرمایا ۔ (ندوی، مجیب اللہ اسلامی فقہ جلد دوم رامپور صفحہ ۳۵۵۔

۲۰؎ دی اسپرٹ آف اسلام صفحہ ۸۴ ۲۱؎ ایضاً صفحات ۸۵-۸۶ ۲۲؎ ایضاً ص ۸۶

۲۳؎ اس کا موازنہ ان درندگیوں سے کیجئے جو اہل یونان و روم، اہل ایران، یہود و نصاریٰ روا رکھتے تھے کہ وہ اپنے قیدیوں کو زندہ جلا ڈالتے تھے۔ دی اسپرٹ آف اسلام ص ۸۷ (حاشیہ)

۲۴؎ ایضاً صفحات ۸۶—۸۷ ، الواقدی، فتوح الشام جلد اول دار الجیل ص ۸

آرنلڈ، ٹی ڈبلو، دی پریچنگ آف اسلام دہلی ۱۹۸۴ء صفحات ۴۸-۵۲، ۵۶-۵۸، ۶۱-۶۴، ۶۷-۶۹ -

۲۵ء دی اسپرٹ آف اسلام ص ۱۲۲

۲۶ء مودودی، تفہیم القرآن ۔جلد چہارم دہلی ۱۹۷۳ء صفحات ۱۵۴-۶۹ ۔ انھوں نے مسیح موعود کی حیثیت سے حضرت عیسیٰ کے ظہور ثانی سے متعلق رسول اکرمؐ کی تقریباً تمام حدیثیں نقل کردی ہیں۔

۲۷ء دی اسپرٹ آف اسلام ص ۱۵۸ ۔ ۲۸ء ایضاً ص ۱۵۷-۵۸

۲۹ء ایضاً ص ۲۱۸ ۔ ۳۰ء ایضاً ص ۲۱۸-۲۱۹ ۔ ۳۱ء ایضاً ص ۲۲۰-۲۱

۳۲ء ایضاً ص ۲۲۲ ۔ ۳۳ء ایضاً ص ۲۲۳ ۔ ۳۴ء ایضاً ص ۲۲۴

۳۵ء ایضاً ص ۲۲۳ ۔ ۳۶ء ایضاً ۔ ۳۷ء ایضاً ص ۲۲۴

۳۸ء ایضاً ص ۲۲۶ ۔ ۳۹ء ایضاً ص ۲۲۴ ۔ ۴۰ء ایضاً ص ۲۲۶

۴۱ء ایضاً ص ۲۲۲ ۔ ۴۲ء ایضاً ص ۲۲۰ ۔ ۴۳ء ایضاً ص ۲۲۷

۴۴ء ایضاً ص ۲۲۲-۲۳ ۔ ۴۵ء ایضاً ص ۲۲۷ ۔ ۴۶ء ۴۷ء ایضاً ص —

۴۸ء ان کے نزدیک بیویوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہ تھی۔ ہر شخص بیک وقت جتنی بیویاں چاہے رکھ سکتا تھا۔ ترمذی میں ص ۱۹۰ پر ابن ماجہ میں ص ۱۴۴ پر اور ابوداؤد ج اول ص ۳۰۳ پر یہ واقعہ درج ہے کہ غیلان الثقفی اور قیس بن حرث کے پاس بالترتیب دس اور آٹھ بیویاں تھیں۔ سر سید نے اپنے مضمون ازواج مطہرات مشمولہ سرسید کے آخری مضامین لاہور ۱۸۹۸ء کے صفحہ ۱۴۸ پر اور مولانا مودودی نے تفہیم القرآن ج اول دہلی ۱۹۷۳ء ص ۳۲۱ پر اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔

۴۹ء دی اسپرٹ آف اسلام ص ۲۲۷-۲۸ ۔ ۵۰ء ایضاً ص ۲۲۸ ۔ ۵۱ء ایضاً ص ۲۲۹

۵۲ء قرآن مجید ۴: ۲۲ ۔ ۵۳ء ایضاً ۴: ۲۳ ۔ ۵۴ء دی اسپرٹ آف اسلام ص ۲۲۹

۵۵ء ایضاً ۔ ۵۶ء ایضاً۔ لفظ عدل کے مفہوم میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس کے مفہوم میں محبت و شفقت کے معاملہ میں مکمل مساوات بھی شامل ہے۔ امیر علی کا یہی خیال ہے۔ اس کے برعکس دوسرے علماء صرف نفقہ کے بارے میں مساوات کو اس لفظ کے دائرہ میں شامل سمجھتے ہیں اور قانون کی زبان میں نفقہ سے مراد غذا، لباس، مکان اور دوسرے ازدواجی تعلقات و ضروریات ہیں۔ مولانا مودودی، سید قطب اور دیگر علماء کا یہی خیال ہے۔ قرآن میں عائد کردہ شرط کے مطالعہ سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ اس سے مراد غذا، مکان، لباس اور دیگر ازدواجی معاملات میں ایک شوہر کو مساوات کا خیال رکھنا چاہیے، تمام معاملات میں یہ لازم نہیں ہے اس لیے کہ بقول مولانا مودودی اور محمد قطب یہ ناممکن ہے

اور جس کے امکان کو خود قرآن بھی مسترد کرتا ہے۔ مودودی مولانا حقوق الزوجین، لاہور ۱۹۷۰ء صلا
قطب، محمد۔ اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، دہلی ۱۹۸۱ء ص۳۴۹

۵۷ دی اسپرٹ آف اسلام ص۲۳۰ ۵۸ ایضاً

۵۹ اسلام نے تعدد ازواج کو لازم نہیں کیا ہے بلکہ چند مخصوص شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے۔

۶۰ تفہیم القرآن ج اول ص۳۲۱-۲۳، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات ص۲۹۸-۳۰۰
علی سید حامد۔ تعدد ازواج۔ دہلی ۱۹۶۸ء، رضا محمد۔ محمد رسول اللہ بیروت ۱۹۷۵ء ص۳۶۳-۶۵

۶۱ آپ کی شادیوں کے متعدد اسباب ہیں اپنے دشمنوں کی دشمنی کو ختم کرنا، بعض غلط قسم کے رواج خلا منہ بولے بیٹے کی بیوی سے شادی کو حرام سمجھنا، کو ختم کرنا اور بیویوں کے ذریعہ مختلف عہد کی خواتین تک عورتوں سے متعلق مخصوص اسلامی تعلیمات کی تبلیغ بھی شامل ہے (تفہیم القرآن ج چہارم، مطبوعہ دہلی ۱۹۸۲ء صفحات ۱۱۵-۱۶)

۶۲ دی اسپرٹ آف اسلام ص۲۲۶ رسول اکرمؐ کے بیٹے حضرت عبداللہ کی وفات پر عاص بن وائل، ابوجہل عقبہ بن ابی معیط اور ابولہب نے آپ کو ابتر کے لقب سے پکارا جس کے مفہوم میں کسی کا لاولد ہونا یا مقطوع النسل ہونا شامل ہے۔ ۶۳ دی اسپرٹ آف اسلام ص۲۲۷ ۶۴ تفہیم القرآن ج چہارم ص۱۱۲-۱۵

۶۵ دی اسپرٹ آف اسلام صفحات ۲۴۲-۲۴۳۔ ابوداؤد، ابن ماجہ، حقوق الزوجین ص۵۱

۶۶ شادی کا اہم مقصد انسان کو اپنے اخلاق و عصمت کی حفاظت کرنے، احکام خداوندی کی تعمیل کرنے اور امن و سکون اور محبت و شفقت کی زندگی گزارنے کے قابل بنانا ہے (قرآن مجید ۲: ۲۲۹، ۳۰: ۲۱)

۶۷ بخاری جلد دوم دہلی ص۷۶۵، ابوداؤد، حقوق الزوجین ص۲۶-۲۷ ۶۸ قرآن مجید ۳۰: ۴۹

۶۹ حقوق الزوجین ص۱۰۰۔ تفہیم القرآن ج اول ص۱۴۹-۵۱۔ اسلام اور جدید ذہن کے شبہات ص۲۰۷-۱۴

۷۰ قرآن مجید ۴: ۳۴۔ ابن ماجہ، کتاب النکاح، حقوق الزوجین ص۴۵-۴۷

۷۱ امیر علی کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ رسول اکرمؐ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں عملاً اس بات کو روک دیا تھا کہ کوئی شخص قاضی کی اجازت کے بغیر حق طلاق کا استعمال کرے۔ (حقوق الزوجین صفحات ۵۱، ۴۳، ۱۰۲، تفہیم القرآن ج ششم ص۱۱۱۔ اسلام اور جدید ذہن کے شبہات ص۱۹۹)

۷۲ قرآن مجید ۲: ۲۲۹، حقوق الزوجین صفحات ۵۸-۶۱، ۱۱۱-۱۲، ۱۱۵، ۱۲۸-۱۳۰، ۱۳۵-۳۸، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات۔ صفحات ۱۸۳، ۲۱۱۔ ۷۳ قرآن مجید ۲: ۲۳۰، حقوق الزوجین، صفحات ۵۷-۵۸، تفہیم القرآن ج اول صفحات ۱۷۶-۷۷۔ ۷۴ حقوق الزوجین ص۵۹

۷۵ تفہیم القرآن ج اول صفحات ۳۴۰-۴۱، مودودی الجہاد فی الاسلام دہلی ۱۹۸۲ء صفحات ۱۵۳-۵۵

اسلام اور جدید ذہن کے شبہات صفحات ۹۶ – ۹۷، ۱۰۴ – ۱۰۵ ۷۶ھ تفہیم القرآن جلد ششم ص ۹۰–۹۱

۷۷ھ قرآن مجید ۳۳: ۳۳، ۵۳، ۵۵، ۵۹ ۔ تفہیم القرآن جلد چہارم صفحات ۹۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۹ – ۳۲

۷۸ھ دی اسپرٹ آف اسلام صفحہ ۲۴۰ ۔ ۷۹ھ ایضاً ۸۰ھ ایضاً

۸۱ھ بخاری جلد اول کتاب البیوع، دہلی ص ۲۹۷، دی اسپرٹ آف اسلام ص ۲۶۵

۸۲ھ اس شرط میں کچھ استثنائی صورتیں بھی ہیں۔ اسلامی حکومت ایسے قیدیوں کو سزائے موت دے سکتی ہے جو مسلمانوں کے سخت ترین دشمن رہے ہوں یا حملہ آور ہوں یا دوسرے کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے اکسانے والے ہوں یا مسلمانوں کے قائد کو ختم کر دینے کی سازش میں شریک ہوں، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الجہاد فی الاسلام ص ۳۱۲ تفہیم القرآن ج پنجم دہلی ۱۹۷۳ء ص ۱۳

۸۳ھ تفہیم القرآن جلد پنجم ص ۴۲–۴۴، الجہاد فی الاسلام صفحات ۲۴۹ – ۲۵۰، ۲۵۸ – ۵۹، ۲۴۰ ۔ خدا بخش دی ری نیساں آف اسلام، دہلی ۱۹۷۹ء ص ۱۶۸، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات ۔ صفحات ۶۳ – ۶۵، ۶۷ – ۶۹، ۷۱ – ۷۲، بخاری جلد اول کتاب العتق صفحات ۳۴۶ – ۴۷

۸۴ھ الجہاد فی الاسلام ص ۲۵۳ – ۵۴ ۸۵ھ ایضاً ص ۲۵۲ تفہیم القرآن جلد پنجم ص ۱۷۰

۸۶ھ قرآن مجید ۲۴: ۳۳، ۴۷: ۴، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات صفحات ۶۹ – ۷۰، ۷۲ – ۷۳ الجہاد فی الاسلام ص ۲۵۶ – ۵۸

۸۷ھ ابن سعد، الطبقات ۔ مختصر سیرۃ ابن ہشام، بیروت ۱۹۷۷ء ص ۲۹۸، دی ری نیساں آف اسلام ص ۱۹۸

۸۸ھ ابوداؤد جلد دوم کتاب الادب باب حق الملوک، ابن ماجہ ابواب الوصایا

۸۹ھ "ذمی" کی اصطلاح سے خود یہ واضح ہوتا ہے کہ اس سے ایسے لوگ مراد ہیں جو اسلامی حکومت کی حفاظت میں رہتے ہوں ۔ ۹۰ھ الجہاد فی الاسلام ص ۱۵۹

۹۱ھ ایضاً ص ۱۴۲ دی پریچنگ آف اسلام ص ۴۹ – ۵۲

۹۲ھ دی پریچنگ آف اسلام صفحات ۶۰ – ۶۱ ۹۳ھ ایضاً ۶۲ – ۶۳

۹۴ھ ایضاً ص ۶۲ ۹۵ھ ایضاً ص ۶۱

۹۶ھ دی اسپرٹ آف اسلام ص ۲۷۵، ذمیوں کے حقوق کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو علامہ شبلی کی کتاب الفاروق جلد دوم اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء صفحات ۱۳۵ – ۱۴۵ اور الجہاد فی الاسلام ص ۲۸۸ – ۹۰

نوٹ: یہ مضمون "ہمدرد اسلامکس" (Hamdard Islamicus) ناظم آباد کراچی کے شمارہ نمبر ۴ (Vol. XI) میں بعنوان A critical story of the Sprit of Islam شائع ہوا تھا۔

۱۹۶۸ء